



Atlantis  
Publications

# وسرا حیرال

Uploaded By Muhammad Nadeem

اشتیاق احمد



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

محمود، فاروق، فرزانه اور انس کٹر جمشید سرینز

# دوسرا حیرال

اشتیاق احمد

اٹلانٹس  
پبلکیشنز



## دوباتیں

السلام علیکم!

دوسرے جیرال سے ملے..... جی ہاں..... دوسرے جیرال سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوگی..... جیرال کا منصوبہ کے بعد جیرال کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا..... قارئین کا اصرار تھا کہ جیرال ہی پر ناول لکھنا چلا جاؤں..... آخر جیرال پر کام شروع ہوا اور دوسرا جیرال تیار ہوا۔ یوں تو اس کا نام جیرال تھا اور اب فاروق احمد صاحب اپنے ہاں اسے شائع کرنے لگے تو نام دوسرا جیرال کر دیا۔ گویا نام رکھنے میں بھی مجھ سے دو ہاتھ آگے نکل گئے..... اللہ کا شکر ہے صرف دو ہاتھ آگے نکلے..... اگر کہیں تین ہاتھ آگے نکل جاتے تو اس ناول کا نام انہیں تیسرا جیرال رکھنا پڑتا اور آپ کہہ اٹھتے کہ یہ کیا..... یہ تیسرا جیرال کہاں سے ٹپک پڑا..... دوسرے کی حد تک تو چلو ایک بات بھی ہے اور ٹھیک بھی ہے۔

اس طرح آپ تیسرا جیرال سے بال بال بچے..... اس میں شک نہیں یہ صاحب نام رکھنے میں اپنا نام پیدا کرتے جا رہے ہیں اور میرے کان کاٹے جا رہے ہیں حقیقت یہی ہے کہ میں کچھ اونچا سننے لگا ہوں..... اگر حال یہی رہا تو آپ خود سوچئے..... بات کہاں سے کہاں جا پہنچے گی..... اللہ وہ وقت نڈائے آمین۔

ایک مشکل یہ ہے کہ فاروق صاحب چاہتے ہیں میں پرانے ناولوں کی نئی دوباتیں ذرا لمبی لکھا کروں..... یہ ایک نیا کام ہے..... پرانے ناولوں کی پرانی دوباتیں کیا کم تھیں کہ اب نئی دوباتیں لکھنا پڑ رہی ہیں..... ہے نا! الجھن کا کام..... ایسی الجھنوں سے دوچار ہونا اب اپنا روز کا کام ہو چلا ہے..... اس لئے کسی سے کیا کھا..... اچھا اللہ حافظ!

شعبان

## بے ہوش آدمی

بیوی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔ پورے آسمان پر صرف ایک ستارہ، وہ بھی آگ کی طرح روشن۔ ایسا نظارہ اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔

اُس رات زبردست ابر تھا۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں چاند اور ستارے بھلا کہاں نظر آتے۔ دور دور تک تلاش کے باوجود اسے کوئی ستارہ نظر نہیں آ سکا تھا، لیکن پھر اچانک صرف اور صرف ایک ستارہ چمکا، آگ کا شعلہ سا لگا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس کی نظریں اس پر جم گئیں۔ پھر گھبرا کر اس نے بلدی سے ایک نظر ادھر ادھر آسمان پر ڈالی، لیکن نہ چاند نظر آیا نہ دوسرے ستارے۔ بس پورے آسمان پر وہی ایک ستارہ تھا۔

لیکن اس قدم سرخ ستارہ۔ آگ جیسا ستارہ، اُس نے

”ادھو — میں کیوں نہ ڈیڈ کو بلا لاؤں — مگر نہیں۔  
اس دوران اگر یہ زمین پر آ رہا تو مجھے پتا نہیں چل  
سکے گا کہ کہاں گرا ہے — میں یہیں ٹھہروں گی۔“

آگ کا تھال بڑا ہوتا گیا — اور بڑا ہوتا گیا —  
یہاں تک کہ اسے یوں لگا جیسے نیچے آنے تک وہ کئی کھیلوں  
کو اپنی پلیٹ میں لے لے گا — اب وہ گھبرا گئی —  
تھال مسلسل نیچے آ رہا تھا — اور اب یہ بات یقینی نظر آ  
رہی تھی کہ وہ زمین پر ضرور گرے گا۔

”اور اگر یہ زمین پر گرا تو کئی کھیلوں میں آگ لگ جائے  
گی — اب تو اس میں آگ کے شعلے تک نظر آ رہے ہیں۔“  
اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”پھر — میں کیا کروں — میں کیا کر سکتی ہوں — اب تو ڈیڈ  
کو بچانا ہی ہو گا۔“

ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ تھال زمین پر آگرا اور  
اپنی اپنی چھت کی وجہ سے اس نے صاف دیکھا کہ وہ بہت  
دُور — دُور بہت دُور کھیتوں میں گرا تھا اور کھیت جلنے  
لگے تھے — اب وہ اور نہ ٹھہر سکی — نیچے کی طرف دوڑی  
اور ڈیڈ کے کمرے میں جا کر دم لیا — ڈیڈ گہری نیند میں  
تھا — مٹی بھی نیند کے مزے لے رہی تھی — اس نے

آج تک نہیں دیکھا تھا، ابھی وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا  
کھا رہی تھی کہ اچانک ایک اور حیرت کا غوطہ اسے سمندر  
کی تر کی طرف لے گیا — ستارہ بلا کی رفتار سے نیچے  
رہا تھا:

”ارے! یہ — یہ تو نیچے آ رہا ہے — شاید ٹوٹ گیا  
ہے — ہاں ستارے ٹوٹتے بھی تو رہتے ہیں، لیکن یہ اس  
قدر سُرخ کیوں ہے — کیا اس ستارے کو آگ لگ گئی ہے  
بہت اونکھا خیال تھا — ستارے کو آگ — وہ مسکرا دی  
اسے ستاروں میں بہت دلچسپی تھی — ہر روز رات کو چھت  
پر چڑھ کر بہت دیر تک ستاروں کو دیکھنا اس کا مشغلہ  
تھا — اور اس کے ڈیڈی مٹی اس کے اس شوق کے ہاتھوں  
بہت تنگ تھے — بہت بھنایا کرتے تھے، لیکن وہ بھی  
اس شوق کے ہاتھوں مجبور تھی —

اچانک اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف بھی  
شامل ہو گیا — خوف اس لیے کہ ستارہ جوں جوں نیچے  
آ رہا تھا، اس کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور اب وہ  
ستارہ کم اور آگ کا ایک بڑا سا تھال زیادہ لگ رہا تھا:  
آگ — کیا چیز ہے؟ وہ بڑ بڑائی، پھر چونک کر خود  
نے بولی:



نیچے آتا گیا۔ بڑا ہوتا گیا اور نیچے گرتے وقت وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور اس کو آگ لگ گئی تھی۔

”کر تو دیا۔ شہاب ثاقب ہو گا۔“

”شہاب ثاقب اس قدر گول نہیں ہو سکتا۔ بالکل تراشا ہوا گول تھا۔ آپ اوپر چل کر ایک نظر دیکھ تو یوں۔“

”پلین ڈیڈ۔“

”اچھا بابا۔ تم نہیں مانو گی۔ لیکن ٹھہرو۔ ہمیں اوپر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں رسد گاہ والوں سے پوچھتا ہوں۔ انہوں نے بھی تو اس کو دیکھا ہو گا۔“

”اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ پومی نے خوش ہو کر کہا۔“

اس کا ڈیڈ انشارجہ کا وزیر خارجہ تھا۔ اس نے فردا ایک مین دبایا اور بولا:

”رسد گاہ سے ملاؤ۔“

چند سیکنڈ بعد رسد گاہ کے انچارج کی آواز سنائی دی:

”ییس سر۔ کیا حکم ہے؟“

”سنا ہے، آسمان سے کوئی شہاب ثاقب گرا ہے؟“

”نہیں سر۔ وہ شہاب ثاقب نہیں ہے۔ ہمارے آدمی

اس طرت جا چکے ہیں۔ ایک گھنٹے تک ہم کچھ بتا سکیں گے۔“

”اوہو اچھا۔ خیر۔ جونہی اس کے بارے میں معلوم ہو،

ڈیڈ کو جھنجھوڑ ڈالا:

”ڈیڈ اٹھیے۔ غضب ہو گیا۔“

”لگ۔ کی ہو گیا؟ ڈیڈ نے نیند کے عالم میں کہا۔“

”غضب۔“

”غضب۔ رات کے وقت کیسے ہو گیا۔ سو جاؤ۔ تنگ

کرد پومی۔“

”اوہو ڈیڈ۔ آپ بات بھی تو سنیے۔“

”اچھا سناؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ مجھے نیند نے ستایا ہوا

ہے۔ پچھلی رات صدر کے ساتھ میٹنگ تھی۔ سو نہیں کا تھا۔“

”مین ڈیڈ! میں جانتی ہوں، لیکن آپ یہ بات نہیں جانتے

آسمان سے کوئی چیز گری ہے۔ آگ کے ایک بہت بڑے

تھاں کی طرح اور اس کے گرتے ہی کھیتوں کو آگ لگ

گئی ہے۔“

”بس اتنی سی بات۔ ہزار بار کہا ہے۔ ستاروں کو

لگا کر د۔ یہ بھی کوئی شوق ہے۔ ارے بھئی۔ وہ کوئی

شہاب ثاقب ہو گا۔ جاؤ سو جاؤ۔“

”اوہو ڈیڈ۔ آپ سنیے بھی تو سہی۔ پورے آسمان پر

گہرا ابر ہے۔ نہ چاند ہے، نہ ستارے۔ ایسے میں ایک

بالکل سرخ ستارہ میں نے نیچے گرتے دیکھا۔ جوں جوں وہ

مجھے اطلاع دینا۔

یس سر۔

اب وہ پومی کی طرف مڑا۔

ایک گھنٹے بعد معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔

اب تم سو جاؤ۔

نہیں ڈیڈ۔ میں اس طرف جاؤں گی۔ جس طرف وہ

گرا ہے۔

پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔

ہاں ڈیڈ۔ میں ایسی چیزوں کے لیے پاگل ہو جاتی ہوں۔

یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ آپ گٹھڑی نکالیں اور مجھے اس

طرف لے چلیے۔

لیکن ہم راتا کیسے طے کریں گے۔ کھیتوں تک پہنچنا آسان

کام نہیں ہے۔ اس طرف رسد گاہ والے تو ہیلی کاپٹر پر

گئے ہوں گے۔

تو آپ کے لیے ہیلی کاپٹر کیا شکل ہے۔ آپ بھی

کاپٹر منگوا لیں۔

لیکن بھئی اس کی ضرورت کیا ہے؟ سوال تو یہ ہے۔

ضرورت ہے ڈیڈ۔ آپ نے سن لیا۔ وہ شہاب ثاقب

نہیں ہے۔

تو پتا چل جائے گا۔ کہ وہ کیا چیز ہے۔

نہیں ڈیڈ۔ ہم بھی ہیلی کاپٹر پر جائیں گے۔

اچھا بابا۔ تم نہیں مانو گی۔ ڈیڈ نے جھٹکا کر کہا۔

اور پھر اس نے ہیلی کاپٹر کے لیے فون کیا۔ جلد ہی

دونوں اس طرف اڑے جا رہے تھے۔ جہاں وہ تھال

گرا تھا۔ چند منٹ بعد وہ وہاں اترے۔ رسد گاہ والوں

کا ہیلی کاپٹر بھی وہاں موجود تھا۔ وزیر خارجہ کو دیکھ کر

وہ ان کی طرف پک پڑے۔

سر! آپ کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک نے حیران

ہو کر کہا۔

یہ میری پاگل بچی۔ اس نے جھٹکا کر کہا۔

آپ لوگ اب تک کیا معلوم کر سکے؟ پومی بولی۔

آگ بہت شدید ہے۔ فی الحال ہم نزدیک جاتے کے

قابل نہیں ہیں۔ فائر بریگیڈ والے بس آنے والے ہیں۔

آپ کے خیال میں یہ کیا ہے؟

ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شاید یہ کوئی اڑن طشتری ہے۔

کیا۔ اڑن طشتری؟ وزیر خارجہ اور پومی ایک ساتھ چلائے۔

یس سر۔ آثار مینی کر رہے ہیں۔ ویسے ابھی یقین سے

کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا۔



”خیر۔ دیکھتے ہیں۔ اس نے کندھے اچکائے۔

اور پھر وہاں فائر بریگیڈ پہنچ گیا۔ انھوں نے نہایت تیزی سے کام شروع کر دیا۔ آدھ گھنٹے بعد آگ بجھ گئی۔ وہ آگے بڑھے۔ پومی سب سے آگے تھی۔

”اغیس روکیے سر۔ آگے خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔“

پومی۔ سب سے آگے نہ جاؤ۔

”کچھ نہیں ہو گا ڈیڈ۔“

ڈیڈ منہ بنا کر رہ گیا۔ سب لوگ آگے بڑھتے چلے گئے۔ نزدیک پہنچ کر انھوں نے دیکھا۔ وہ واقعی اٹن طشتری جیسی کوئی چیز تھی۔ لیکن جل چکی تھی۔ البتہ اس کا دروازہ بند تھا۔

”اس کا دروازہ کھولائیے۔“ پومی پرجوش انداز میں بولی۔

”ہاں! یہ تو خیر اب کرنا ہو گا۔“

انھوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش شروع کی۔ اس کام میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اس دوران پومی کا مارے بے چینی کے بُرا حال تھا۔ پھر جونہی دروازہ کھلا۔ اس نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ اسے بڑی شکل سے روکا گیا۔ اور رسد گاہ کے دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔

ایچانک ان دونوں کی چیخ سنائی دی :

”کیا بات ہے۔ خیر تو ہے؟“

”اندر ایک انسان موجود ہے۔ بے ہوش انسان۔“

”اوہ۔“ تو پھر اسے جلدی سے باہر نکال لو۔ پومی نے چلا کر کہا۔

اب ان سب کی حیرت بہت بڑھ چکی تھی۔ پومی کا تو مادے حیرت کے بہت بُرا حال تھا :

”اب۔“ اب کیا ہو گا؟ پومی چلائی۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ آرام سے کھڑی رہو۔“ ڈیڈ نے اسے ڈانٹا اور وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

بے ہوش آدمی کو باہر نکالا گیا۔ اس کے چہرے پر ہیلٹ کی قسم کی ٹوپی تھی، اس لیے چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس ٹوپی کو اتارا گیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے جسم پر شاید فائر پروف لباس تھا اور اٹن طشتری اندر سے فائر پروف تھی۔ وہ آگ کا اثر اندر بھی آتا اور وہ جل جاتا، لیکن اس کے جسم اور پکڑوں پر جلنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔

یہ۔۔۔ یہ تو بالکل ہم جیسا لگتا ہے۔ جیسے اناجہ کا ہی باشندہ ہو۔ وزیر خارجہ نے کہا۔

”یس مسٹر کاٹن۔“ ایسا ہی لگتا ہے، لیکن ہمارے

ملک میں اس قسم کی اڈن طشتریاں کہاں ملتی ہیں بھلا۔  
 "یہ تو اب ہوش میں آنے پر بتائے گا۔ میرا خیال  
 ہے۔ اے ہسپتال پہنچا دینا چاہیے۔"  
 یہ ٹھیک رہے گا۔

اور پھر اے ہسپتال لے جایا گیا۔ خاص نگرانی والے  
 وارڈ میں اسے رکھا گیا۔ فوری طور پر کئی محکموں کو  
 اطلاعات دی گئیں۔ ان میں محکمہ سرائعسانی کو بھی فون  
 کیا گیا، تاکہ وہ اپنی تحقیقات شروع کر دے۔ ادھر  
 اسے ہوش میں لانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔  
 پومی کا بُرا حال تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ بے ہوش آدمی  
 جلد از جلد ہوش میں آ جائے، لیکن ڈاکٹروں کی پوری ٹیم  
 ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

"ڈیڈ! آخر یہ کب ہوش میں آئے گا؟ پومی نے  
 بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟ اس نے جمل کر کہا۔

اُسی وقت محکمہ سرائعسانی کا عملہ دہاں پہنچ گیا۔ اس ٹیم  
 نے فوری طور پر بے ہوش آدمی کو دیکھنے کی خواہش  
 ظاہر کی۔ انہیں اندر لایا گیا۔ پومی اور کاٹن اندر  
 ہی موجود تھے۔

ٹیم کی نظریاں بے ہوش آدمی پر جم گئیں۔ پھر وہ سب کے  
 سب بُری طرح آپہلے۔  
 ان کی آنکھیں مادے حیرت کے پھل گئیں۔



”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... مسٹر جیرال تو واقعی مرچکے ہیں، اس بات کی مکمل طور پر تصدیق ہو چکی ہے۔“ کاٹن نے کہا۔

”جی ہاں! تب پھر ہو سکتا ہے..... یہ ان کا کوئی ہم شکل ہو.....“

”ہم شکل..... اس اڈن طشتری میں..... آخر یہ چکر کیا ہے؟“

”آپ لوگ یہیں ٹھہریں..... ہم مسٹر جیرال کی فائل لے کر آتے ہیں۔“

”ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔“ کاٹن نے پر جوش انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد جیرال کی مکمل فائل وہاں موجود تھی، اس میں جیرال کی ان گنت تصاویر بھی تھیں..... ان تمام تصاویر کو اور بے ہوش آدمی کو پورے غور سے ٹکٹکی باندھ باندھ کر دیکھا گیا.....

جیرال کی تصاویر میں اور بے ہوش آدمی میں ایک ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا..... ایتنا یہ تھی کہ بے ہوش آدمی کے بائیں کان سے نیچے ایک سیاہ تیل دیکھا گیا..... جیرال کی تصاویر میں بھی وہ تیل بائیں کان سے نیچے موجود تھا۔

”اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں..... یہ مسٹر جیرال ہیں..... ان کے ہم شکل نہیں ہیں۔“ محکمہ سراغ رسانی کے ایک ماہر نے کہا۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے..... مسٹر جیرال پاک لینڈ کے

کمپوز جشیڈ اور انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ کے ہاتھوں مارے گئے تھے،

## چلی بانی

”کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔ آپ لوگ اسے دیکھ کر اس قدر ذہد سے کیوں چونکے؟ کاٹن نے جیرال ہو کر پوچھا۔

”یہ۔ یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان میں سے ایک کے بدحواسی کے عالم میں کہا۔

”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ۔ زندہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایک نے کہا۔

”کون زندہ کیسے ہو سکتے ہیں۔“ کاٹن نے منہ بنایا۔

”یہ۔ جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں۔ مدت ہوئی، یہ مر چکے ہیں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کن کی بات کر رہے ہیں؟“

”جیرال کی۔“

”کیا کہا۔ جیرال کی۔ یہ۔ یہ۔ یہ مسٹر جیرال ہیں۔“

”بالکل۔ سو فی صد جیرال۔“

اس بات کی تصدیق پوری طرح کر لی گئی تھی اور اس میں ایک فی صد بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

”لیکن ہم اس شخص کو کیا کریں۔ یہ بھی تو بتائیں۔“

”اس کا حل صرف یہ ہے کہ اسے ہوش میں لایا جائے۔ یہ خود بتائے گا کہ یہ کون ہے اور اس اڈن طشتری میں یہ کہاں سے آ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب پورا زور اسے ہوش میں لانے کے لئے لگانا ہو گا۔“

ڈاکٹر اور بھی زور شور سے حرکت میں آ گئے۔ آخر تین گھنٹوں کی سر توڑ کوشش کے بعد اس شخص نے آنکھیں کھول دیں:

”اوسے! آپ ہوش میں آ گئے۔ یہ کس قدر خوشی کی بات ہے۔ آپ کون ہیں، اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے۔“

”پوں چاشی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔“

”پوں چاشی۔ یہ آپ نے اپنا نام بتایا؟“ کاٹن بولا۔

”سے ماگاشی۔ وہ پھر بولا۔“

”اوہ۔ آپ کی زبان اور ہے۔ یہ تو مشکل پیدا ہو گئی۔“

کاٹن نے کہا۔

”تب پھر۔ یہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔ پوی نے چلا کر کہا۔“

”کیا! اوہ سب ایک ساتھ چلائے۔“

یہ خیال اب تک ان کے ذہنوں میں نہیں آیا تھا۔ پوی کے چلنے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔

”ہاں واقعی۔ اس بات کا امکان ہے۔“

”اے۔۔۔ لیکن۔ بالکل جبرائیل کی شکل کا انسان دوسرے کسی سیارے پر۔“ کاٹن نے کہا۔

”یہ بات ناممکن نہیں سر۔ ایک آفسر نے کہا۔“

”اے۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ان اڈن طشتریوں کے ذریعے ہم پر حملہ آور ہونے والی ہے۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ فی الحال زبان کا مسئلہ حل کرنا ہو گا۔“ کاٹن نے کہا۔

”اوہ! اے!“

زبان کے ماہرین دلوں بٹلائے گئے۔ ان کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ جلد از جلد اس شخص کو انگریزی بولنے اور سمجھنے کے قابل بنائیں۔ انہوں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔

جواہیں دے دی گئی۔ کاٹن کی ہدایات کے مطابق اس معاملے کو بالکل خفیہ رکھا گیا۔

ایک ہفتے بعد اس شخص کو کاٹن کے سامنے پیش کیا گیا:



اس نے آگ پکڑ لی اور میں یہاں آپ کے ہاں آگیا۔ یہاں  
بہک کر وہ خاموش ہو گیا۔

آپ اپنے سیارے کو کیا کہتے ہیں؟  
"چلی بانی۔"

"بہت خوب! آپ چلی بانی سے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔ کیا یہ نام آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں۔ لیکن شاید ہم چلی بانی کو کسی اور نام سے پکارتے  
ہوں گے۔ خیر اس بات کو چھوڑیں۔ اب آپ کا پروگرام  
کیا ہے؟"

"افسوس! اب میں اپنے سیارے پر واپس نہیں جاسکتا،  
اس کے لیے صرف اور صرف وہ اٹن طشتری میرے کام  
آ سکتی تھی۔"

"تب آپ یہاں ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

"ہم آپ کو ایک حیرت انگیز چیز دکھانا چاہتے ہیں، تاکہ

ہم آپ کو بتا سکیں کہ آپ ہمارے لیے کیا ہیں؟"

"کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں۔ اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم ابھی اپنا مطلب واضح کرتے ہیں۔"

اور پھر اس کے سامنے حیران کی فائل رکھ دی گئی۔

"اب اس کی کیا پوزیشن ہے؟"

"اس قابل ہو گئے ہیں کہ ہماری بات سمجھ سکیں اور اپنی

سمجھا سکیں۔ ویسے یہ رات ذہین ہیں۔ ورنہ ایک ہفتے میں

اس قدر زبان سیکھ جانا قریب قریب ناممکن ہے۔"

"ہنوں ٹھیک ہے۔ اب ہم ان سے بات چیت کرتے ہیں۔"

باقی ماہرین اور دوسرے بڑے آفیسرز بھی اس کارروائی میں

حصہ لیں گے، لہذا ان حضرت کو ایوان صدر نے جایا جائے۔

کاٹن نے حکم دیا۔

ایک گھنٹے بعد تمام ذمے دار لوگ ایوان صدر میں موجود

تھے۔ مہمان ان کے درمیان میں موجود تھا۔ سب کی

نظریں اس پر جمی تھیں۔

"آپ اپنے بارے میں کیا بتانا پسند کریں گے؟"

"میں۔ آپ کے اس سیارے کا انسان نہیں ہوں، ایک

دوسرے سیارے سے آیا ہوں۔ اس سیارے پر آبادی

حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے، لہذا میری حکومت نے میرے

ذمے یہ کام لگایا کہ میں اپنے سیارے سے باہر نکل کر

دوسرے سیاروں کا پتا چلانے کی کوشش کروں۔ تاکہ

ہم اپنے سیارے کی آبادی کو کسی اور سیارے پر منتقل

کر سکیں، لیکن میری اٹن طشتری میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔

”جونیسی اس میں موجود تصادیر پر اس کی نظر پڑی — وہ زور سے اچھلا :“

”یہ میری تصادیر آپ نے کب آتیں؟“

”یہ آپ کی تصادیر نہیں ہیں : کاٹن نے کہا۔“

”تب پھر — یہ کس کی تصادیر ہیں؟“

”ہمارے ملک — بلکہ اس پوری دنیا کے ایک بہترین“

آدمی کی تصادیر ہیں یہ — اس کا نام جیرال تھا۔“

”کیا کہا — جیرال تھا — کیا یہ صاحب اب زندہ نہیں ہیں؟“

”ہاں ! یہی بات ہے — ہم آپ کو جیرال کی کہانی سنائے“

گئے — بلکہ جیرال کی زندگی کی فلمیں آپ کو دکھائیں گے۔“

پھر آپ کو ساری بات سمجھ میں آئے گی — ہم دراصل“

آپ کو اپنے لیے جیرال بنانا چاہتے ہیں۔“

”لیکن کس لیے؟ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔“

”یہ بات بھی پوری طرح آپ کو معلوم ہو جائے گی۔“

آئیے آپ کو شوڈیو میں لے چلیں — وہاں آپ پہلے فلمیں“

دیکھ لیں۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے — کئی روز تک جیرال کی فلمیں“

دکھائی گئیں — وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہا — بار بار کہ اٹھا :“

”یہ — یہ تو بالکل میں ہوں — مجھ میں اور ان میں تو“

بال برابر بھی فرق نہیں — یہ تو لڑتے بھی بالکل میری طرح“

ہیں — آپ کو دراصل معلوم نہیں — میں اپنے ملک کی“

افیلی جنس کا چیف ہوں — اور اپنے ملک کا سب سے بہترین“

نشانے باز ، لڑاکا — اور لڑائی کی ہر قسم کا ماہر ترین“

انسان — لیکن میں دیکھ رہا ہوں — جیرال بھی بالکل میری“

طرح ہی تھا — حیرت ہے — حیرت ہے۔“

”ابھی ہم آپ کو اور بہت کچھ دکھانا چاہتے ہیں — اب“

ایک اور فلم دیکھیے۔“

اس بار اسے جو فلم دکھائی گئی — وہ انپکٹر جشیڈ انپکٹر“

کامران مرزا اور شوکی برادرز کی فلم تھی — اور اس میں جیرال“

کے لیے — ان تینوں پارٹیوں سے پوری طرح روشناس کرانے“

کے لیے بنائی گئی تھیں — انپکٹر جشیڈ پارٹی ، انپکٹر کامران مرزا“

اور شوکی برادرز کو دیکھ کر اس کا جسم تن گیا — اس کی آنکھیں“

بے ہوش ہو گیا — وہ سب کے سب بوکھلا اٹھے —“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے — کئی روز تک جیرال کی فلمیں“

دکھائی گئیں — وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہا — بار بار کہ اٹھا :“

”یہ — یہ تو بالکل میں ہوں — مجھ میں اور ان میں تو“

بال برابر بھی فرق نہیں — یہ تو لڑتے بھی بالکل میری طرح“

ہیں — آپ کو دراصل معلوم نہیں — میں اپنے ملک کی“

افیلی جنس کا چیف ہوں — اور اپنے ملک کا سب سے بہترین“

نشانے باز ، لڑاکا — اور لڑائی کی ہر قسم کا ماہر ترین“

انسان — لیکن میں دیکھ رہا ہوں — جیرال بھی بالکل میری“

طرح ہی تھا — حیرت ہے — حیرت ہے۔“

ٹھیک ہے۔ اب جب کہ مجھے یہاں رہنا ہو گا۔ تو میں آپ لوگوں کے لیے کام کروں گا۔

”کیا آپ کے پیارے پر بھی اسلام اور دوسرے مذہبوں کا کوئی چکر ہے؟“ کاٹن نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا۔ یہی تو سب سے بڑا رونا ہے۔ یہ مسلمان لوگ کسی کو آرام سے جینے نہیں دیتے۔ ان سے تمام دوسرے مذہب والوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔“

”اوہ! تب تو اور آسانی سے سمجھ جائیں گے آپ مسٹر جیرال۔“

”یہ کیا۔ آپ نے میرا نام بھی جیرال رکھ دیا؟“

”ہاں! اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کا نام صرف اور صرف جیرال ہو سکتا ہے۔“

”خیر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”اب آئے گا مزا۔ قدرت نے ہمیں ایک بار پھر جیرال سے دیا ہے۔“

”اور جب مسٹر جیرال انپکٹر جمشید وغیرہ کے سامنے جائیں گے تو ان کا کیا حال ہو گا۔ ذرا سوچیں۔ پوری پرجوش انداز میں بولی۔

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“ ایسے میں جیرال کی آواز گونجی۔

”شرط۔ وہ کیا؟“

”پوری اس مہم میں میرے ساتھ رہیں گی۔“

”میں ان لوگوں کو دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے پیارے پر بالکل ایسے ہی لوگ موجود ہیں۔“

”کیا! وہ سب کے سب چلا آٹھے۔“

”ہاں! لیکن افسوس۔ میں آپ کو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرے ساتھ

کچھ ہو گا تو میں بھی آپ لوگوں کے لیے قلعیں لے سکتا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

”خیر کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمیں کی بات پر سو فی صد یقین ہے۔ اگر اس پیارے

آپ ہو سکتے ہیں تو وہ لوگ کیوں نہیں ہو سکتے۔ آپ بتائیں۔ کیا دہاں آپ کا ان لوگوں سے مقابلہ ہوتا رہا

”نہیں۔ ایسی کوئی فوجت نہیں آئی۔ لیکن ایسا نظر دلا تھا کہ میرا ان سے کوئی بہت زبردست مقابلہ ہو گا۔“

”تب پھر یہ مقابلہ اب اس زمین پر ہو گا۔“ کاٹن بولا۔

”لگ۔ کیا مطلب؟“

”ہم آپ کو بتائیں گے پوری تفصیلات۔ ہر بات۔ آپ فکر نہ کریں۔ جب تمام تر باتیں آئینے کی طرح آپ کے ذہن میں صاف ہو جائیں گی، اس وقت آپ کو مہم پر بھیجا جائے گا۔“



کیا پوری اچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے مسٹر جیرال۔ یہ بچی ہے۔ ایسی معجزات کے قابل نہیں۔

آپ فکر نہ کریں۔ انھیں لڑنا بھڑنا نہیں پڑے گا۔

لیکن آپ اسے کیوں ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

بس۔ یہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ اور دیکھا جائے

تو مجھے گرتے ہوئے سب سے پہلے انھوں نے ہی دیکھا تھا۔ ڈیڈ ! میں مسٹر جیرال کے ساتھ رہوں گی۔

پولی۔ یہ۔ یہ بہت مشکل ہے۔ کاٹن نے گھبرا کر کہا۔

یہ مشکل نہیں۔ بہت آسان ہے۔ کیوں پولی؟ جیرال ہنسنا

بالکل ٹھیک۔ پولی نے تالی بجا دی۔

خیر۔ جیسے تمھاری مرضی۔ ویسے میرا دل نہیں چاہتا تمھیں

بھیجنے کے لیے۔

آپ فکر نہ کریں۔

لیکن مہم کیا ہے؟ سوال یہ ہے۔

اس کی تفصیلات تو ہم اب آپ کو بتائیں گے۔ آئیے

تھیفہ کمرے میں چلیں۔ وہاں صرف ہم تین ہوں گے۔ کاٹن

نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

تھوڈی دیر بعد وہ ایک الگ کمرے میں بیٹھے تھے۔

رہاٹن جیرال کو ساری بات سمجھا رہا تھا۔

اس کے بعد تقریباً ایک ماہ تک جیرال کو تمام تر معلومات

ہاکی گئیں۔ تب کہیں جا کر وہ مہم پر جانے کے لیے

نکل رہا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ اور پولی ایک ایک

ٹریک سے گھر سے نکل رہے تھے۔ ایک ٹریکسی کے ذریعے

ایر پورٹ پر پہنچے۔ انھیں انشاد جہ سے پاک لینڈ کے

از پر سوار ہونا تھا۔

ان کی مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ جیرال کو پاک لینڈ کے دارالحکومت

سڑکوں تک کا نقشہ ذہن نشین کرا دیا گیا تھا۔

گیارہ گھنٹوں کے سفر کے بعد اعلان کیا گیا:

ہم پاک لینڈ کے دارالحکومت آ رہے ہیں۔

”اس کا مطلب ہے، جب تک تم اپنی آنکھیں بند نہیں کرتیں، اس وقت تک تمہارے کان کام نہیں کرتے۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”کان نہ کھاؤ۔“ فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

”تمہارے کان ہیں کس کھیت کی مولیٰ۔ تین میں نہ ہو میں۔“ فاروق چلا اٹھا۔

”ہائیں۔۔۔ یہ تو وہی بات، مولیٰ۔ اونٹ نہ جانے آنگن میں۔“ فاروق نے پھر کہا۔

”دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیا الٹ پلٹ ہو لے چلے جا

کیوں۔ تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ فرزانہ نے کہا۔ ”یا آج تمہارے دماغ میں تمام محاورے اور ضرب المثال لہجے میں حیرت ہتی۔“ وہ آج کل چھٹی پر ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”اے وہ چھٹی پر کب نہیں ہوتے؟“ محمود ہنسا۔

”کیوں۔ کیوں۔ کیا ہوا؟“ محمود گھبرا گیا۔

”جب خطرے کی گھنٹیاں دن میں بجتی ہیں۔“ فاروق نے کہا۔ ”تم نے کہا ہے۔ اونٹ نہ جانے آنگن میں۔“ جھلا آنگن بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”یاد دماغ نہ چاٹو۔ ہمیں تو دور دور تک کوئی خطرہ نہیں آتا۔“ بھٹی اب تعلق کون تلاش کرے۔ ہم کوئی ان کی گھنٹی سنائی نہیں دے رہی، کیوں فرزانہ؟“ محمود اس کے ملازم ہیں۔“ محمود نے منہ بنایا۔

”کی طرف مڑا۔“ اُدھو۔ یاد آگیا۔“ فاروق چونکا۔

”ٹھہرو! پہلے میں سننے کی کوشش کروں۔“ یہ کہہ کر فرزانہ کیا یاد آ گیا؟

”نے آنکھیں بند کر لیں۔“

## خطرہ بے بو

”میری آنکھوں میں آج صبح سے خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔“

”ہیں۔“ فاروق نے پریشان آواز میں کہا۔

”کیوں۔ تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ فرزانہ نے کہا۔ ”یا آج تمہارے دماغ میں تمام محاورے اور ضرب المثال لہجے میں حیرت ہتی۔“ وہ آج کل چھٹی پر ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”اے وہ چھٹی پر کب نہیں ہوتے؟“ محمود ہنسا۔

”کیوں۔ کیوں۔ کیا ہوا؟“ محمود گھبرا گیا۔

”جب خطرے کی گھنٹیاں دن میں بجتی ہیں۔“ فاروق نے کہا۔ ”تم نے کہا ہے۔ اونٹ نہ جانے آنگن میں۔“ جھلا آنگن بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”یاد دماغ نہ چاٹو۔ ہمیں تو دور دور تک کوئی خطرہ نہیں آتا۔“ بھٹی اب تعلق کون تلاش کرے۔ ہم کوئی ان کی گھنٹی سنائی نہیں دے رہی، کیوں فرزانہ؟“ محمود اس کے ملازم ہیں۔“ محمود نے منہ بنایا۔

”کی طرف مڑا۔“ اُدھو۔ یاد آگیا۔“ فاروق چونکا۔

”ٹھہرو! پہلے میں سننے کی کوشش کروں۔“ یہ کہہ کر فرزانہ کیا یاد آ گیا؟

”نے آنکھیں بند کر لیں۔“

یہ کہ محادہ ہے — ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

”اوہ لال — حد ہو گئی — میں بھی ناچ سے اونٹ پر گیا — وہی بات ہو گئی — اونٹ دے اونٹ تیری کھل سیدھی۔“

”میرا خیال ہے — آج ہم کرید کرید کر محادہ سے رہے ہیں — فاروق بولا۔

”کیا کرید کرید کر؟“ فرزانہ نے اسے گھورا۔

”دماغ اور کیا — اور ہمارے پاس کرید کے رکھا ہی کیا ہے؟“ فاروق بولا۔

”ارے لائیں — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ فرزانہ کے ہلا کی حیرت تھی۔

”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے محمود نے کہا تھا — میرے کان پر چھٹی پر ہیں — پھر محمود تم سن کیسے رہے ہو؟“

”اوہ ارے لائیں — یہ تو میں بھول ہی گیا۔“

”کیا بھول گئے؟“ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”یہ کہ میرے کان آج چھٹی پر ہیں۔“

”حد ہو گئی — بھئی تم بھول گئے — لیکن کان تو بھول جانے کے باوجود چھٹی پر ہیں — پھر آخر تم کیسے سن رہے ہو؟“ فاروق

نے جھٹا کر کہا۔

”پتا نہیں یاد — اب میں کیا بتاؤں — بس کچھ نہ پوچھو۔“

”لوں سمجھ لو میں کچھ بتانے کے قابل نہیں — یا پھر یہ خیال

کر لو کہ تم کچھ سننے کے قابل نہیں رہے — اوہ یہ کہ ہم

اس وقت بالکل — اونگی بونگی باتیں کر رہے ہیں — کچھ تو کام

کی بات کر لیں — محمور کے بغیر کتا چلا گیا۔

”حد ہو گئی — آج تو تم فاروق کے بھی کان کاٹ گئے۔“

”نہیں تو؟“ فاروق نے گھبرا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

پھر کان اپنی جگہ پا کر بولا:

”خدا کا شکر ہے — یہ کئے نہیں۔“

”ارے لال — وہ فاروق کی آنکھوں میں خطرے کی

گھنٹیاں بج رہی تھیں۔“

”بیچنے دو — ہمارا کیا جاتا ہے — کانوں میں بجتیں تو ایک بات

بھی تھی۔“ محمود نے منہ بنایا۔

”بھئی تصویر کے مدد دے رہے ہیں؟“ فرزانہ بولی۔

”تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے — ہوتے ہوں گے، ہمیں کیا۔“

”لاہو — عقل کو ہاتھ مارو، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو،

انگاریے نہ چاؤ۔ اگر فاروق کی آنکھیں بج رہی ہیں تو اس

کو تصویر کا دوسرا رخ خیال کر لو۔ فرزانہ نے تلملائے ہوئے



انداز میں کہا۔

”اوہ! تو تم یہ کہنا چاہتی ہو“

”تو اور تمہارا کیا خیال تھا۔ میں تمہیں الجبرے کے سوال سمجھا رہی تھی۔“ فرزانہ نے آنکھیں نکالیں۔

”وہ تو خیر تم سمجھا بھی نہیں سکتیں۔ الجبرا ہی تو وہ مضمون ہے۔ جس سے تم گھبراتی ہو۔“

”یہ غلط ہے۔ میں الجبرے سے نہیں گھبراتی۔ ہاں الجبرا ضرور مجھ سے گھبراتا ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”میں کہتا ہوں۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ خبردار ہو جاؤ۔ اب میری آنکھیں اور زیادہ گھنٹیاں۔ بلکہ اب تو خطرے کے گھنٹے سن رہی ہیں۔“ فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

”اللہ اپنا رحم فرماتے۔ گھنٹیوں کی جگہ گھنٹوں نے لے لی۔“ فرزانہ گھبرا گئی۔

”ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھنا گھنٹوں کی جگہ گھڑیاں لیں گے اور گھڑیالوں کی جگہ...“ محمود کہتے کہتے رک گیا، اس نے گھبرا کر فرزانہ کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

”وہ۔ گھڑیاں سے بڑی چیز کیا ہوتی ہے؟“

”بس بس۔ گھڑیاں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔“ درنہ میری آنکھوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔“

”وہ اس لیے کہ کانوں کے پردے پہلے ہی پھٹ چکے ہیں۔“

”میں اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔“

”وہ۔ وہ۔ آگیا خطرہ۔“ فاروق گھبرا گیا۔

”ہائیں۔ یہ گھنٹی خطرے سے بجاتی ہے۔“ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں بالکل۔ اس گھنٹی سے بچو۔“

”گھنٹی سے یا خطرے سے؟“ محمود فوراً بولا۔

”اوہو۔ دونوں سے کیوں نہیں بچ جاتے۔“

”لیکن دروازہ تو کھولنا ہوگا۔“ محمود بولا۔

”فاروق کو دہم ہوا ہے۔ آخر میرے بھی کان ہیں۔ آنکھیں

بھی، ناک ہے۔ میں نے اب تک خطرے کی بو کیوں محسوس

نہیں کی۔ لہذا جاؤ اور دروازہ کھول دو۔“

”ہو سکتا ہے۔ یہ خطرہ بے بو ہو۔“ فاروق مسکرایا۔

”محمود نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور دروازے

کی طرف بڑھا:

”کون؟“

”یہ میں ہوں۔ ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔“

”میں کون؟“

”ایک لڑکی۔ ساتھ میں میرے اکل ہیں۔“

" تو یوں کیسے نا۔ ایک انگل آئے ہیں۔ جن کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ محمود نے منہ بنایا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لڑکی بولی۔

" آپ کے انگل گونگے ہیں کیا؟

" نہیں برخوردار۔ میں بول سکتا ہوں۔

محمود کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ فوراً مڑا، فاروق اور فرزانہ

کے پاس آیا اور دہلی آواز میں بولا:

" باہر جو شخص موجود ہے۔ اس کی آواز سن کر مجھے

ایک زبردست جھٹکا لگا ہے۔

" کلک۔ کیا اس کی آواز میں کرنٹ تھا؟ فاروق گھبرا گیا۔

" نہیں یار۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔

" تو تم بھی تو سمجھانے کی کوشش کیا کرو۔ آخر تمہیں جھٹکا

کیوں لگا؟ وہ جھٹکا اٹھا۔

" یہی تو مصیبت ہے۔ محمود نے منہ بنایا۔

" کیا مطلب۔ کیا مصیبت ہے۔ کیسی مصیبت ہے۔

کہاں ہے مصیبت؟

" بات یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ جھٹکا کیوں

لگا ہے۔

" تو جھٹکے سے پوچھ لیتے۔ فرزانہ جل گئی۔

" مشورے کا شکریہ۔ دروازے پر چلو اور تم بھی اس کی آواز سنو، میں دیکھنا چاہتا ہوں، تم دونوں کو جھٹکا لگتا ہے یا نہیں۔

" اچھی بات ہے۔ ابھی تجربہ ہو جاتا ہے۔ فرزانہ بولی۔

اب وہ دونوں بھی دروازے پر آئے۔ اسی وقت دستک ایک بار پھر ہوئی:

" آپ پہلے اپنا تعارف کرائیں، پھر دروازہ کھلے گا۔ محمود نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

" اوکے۔ منو برخوردار۔ میں جوابال ہوں۔

فرزانہ اور فاروق کو زبردست جھٹکا لگا، گرتے گرتے بچے، پھر دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

" یہ۔ یہ۔ یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

" ہم نہیں جانتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، لیکن یہ ہو رہا ہے۔

" آخر دروازہ کب کھلے گا۔ اب تو میں اپنا نام بھی بتا

چکا ہوں۔

" یہی تو مشکل ہے۔ محمود بولا۔

" کیا مشکل ہے۔ ہمیں تو یہاں دور دور تک کوئی مشکل نظر نہیں آتی۔

" یہ آپ کی نظروں اور کانوں کا قصور ہے، بلکہ ناکوں

کا بھی۔" خاردق نے منہ بنایا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو بھائی؟ باہر سے تنگ آ کر کہا گیا۔

"یا تو آپ اپنی اصلی آواز میں بات کریں، یا پھر دروازہ کھولنے کے لیے نہ کہیں اور چلتے پھرتے نظر آئیں۔"

"چلتے پھرتے نظر کیسے آ سکتے ہیں۔ جب کہ دروازہ کھولا ہے۔" باہر سے ہنس کر کہا گیا۔

"ہم چھت پر جا کر دیکھ لیں گے۔"

"اچھا تو پھر میں خود دروازہ کھول رہا ہوں۔ کیونکہ اب آئے ہیں تو ملے بغیر تو جائیں گے نہیں۔" باہر سے کہا گیا۔

"اور دروازہ آپ کیسے کھولیں گے؟"

"یہ میرے بایں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"اچھا ٹھہریں۔ دروازہ تڑوا کر بھی کیا فائدہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر محمود نے دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑے مرد اور لڑکی پر نظریں ڈالتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ کہ آپ کی آواز تو بالکل ہمارے ایک انکل جیسی ہے۔ لیکن شکل۔۔۔ اودہ۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔ اس

کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

"اب کیا ہوا؟ کہتے کہتے رک کیوں گئے، برخوردار۔"

"آپ کی آواز ہی ایک آپ میں نہیں ہے۔ جب کہ آپ خود ایک آپ میں ہیں،" محمود مسکرایا۔

"اودہ! تو تم نے یہ بات بھی محسوس کر لی۔"

"جی ہاں بالکل۔ اس لیے کہ ہم باتوں کو بہت جلد محسوس کر لینے کے ماہر ہیں۔ اور باتیں بے چاری ہمارے آگے پانی بھرتی ہیں۔"

ضرور پانی بھرتی ہوں گی۔ مجھے سو فی صد یقین ہے۔" وہ مسکرایا۔

"یوں بات نہیں بنے گی انکل۔ آپ پہلے ایک آپ اتار دیں۔"

"بھئی اندر چل کر بٹھا تو دو۔ پھر ایک آپ بھی اتار

دوں گا۔ ویسے تمہارے والد نظر نہیں آ رہے۔ ارے

ہاں۔۔۔ پانچ بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔"

"تو آپ یہ بھی جانتے ہیں۔"

"یہ پوچھو۔ میں کیا نہیں جانتا۔"

"چلیے پھر بتا دیں، آپ کیا نہیں جانتے؟"

"میں۔۔۔ بس۔۔۔ یہی تو مشکل ہے۔" وہ بولا۔

"کیا مشکل ہے۔ اب ہمیں دور دور تک کوئی شکل نظر نہیں آ رہی۔"



"یہ کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جو میں تم لوگوں کے بارے میں نہ جانتا ہوں۔"

"اور: تو بات یہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔" محمود بولا۔

"ان باتوں میں بس یہی تو بڑی بات ہے کہ یہ بہت دور تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور ان کو واپس لانا پڑتا ہے۔"

"خیر ہوگا۔ اب آپ فوراً ہماری دلچسپی دود کر دیں۔"

"بھئی۔ کیا بیٹھنے کو نہیں کہو گے۔ آخر میں تمہارا پرانا انکل ہوں۔"

"آپ اس وقت ہمیں الہ دین کے وہ چاچا نظر آ رہے ہیں جو جادوگر تھا۔"

"ہاں شاید۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ خیر تم نہیں کہتے تو میں خود اندر جا کر صحن میں بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے تمہاری امی مجھے ناشتا بھی کرائیں گی۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ شام کا ناشتا۔"

"میں اس چکر میں کبھی نہیں پڑتا۔"

"آئیے۔ آپ کو ناشتا بھی ملے گا اور رات کا کھانا بھی۔"

"خیر اتنی دیر رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"یہ آپ کے ساتھ جو لڑکی صاحبہ ہیں۔ گونگی ہیں کیا؟"

"نہیں تو۔ پہلے تو یہی بولی تھیں۔"

"اور میں اب یہی بول سکتی ہوں۔ لیکن میں آپ لوگوں کی حیرت انگیز گفتگو سن رہی ہوں۔"

"اس میں حیرت انگیزی کہاں سے آگئی؟"

"پپ۔ پتا نہیں۔ لیکن مجھے یہ ساری بات چیت حیرت انگیز ہی لگ رہی ہے۔"

"اچھا خیر۔ اب بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

"جُونہی وہ صحن میں آ کر بیٹھے، ان کی والدہ نے باورچی خانے سے کہا:

"فرش پر کوئی کچڑ بھرا پاؤں کا نشان تو نظر نہیں آ رہا؟"

"وہ اپنی امی کی بات سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے، کیونکہ وہ اس دوران باورچی خانے میں رہی تھیں اور

صحن کی طرف کھلنے والی باورچی خانے کی کھڑکی بدستور بند رہی تھی۔ باورچی خانے کا دروازہ بھی بند تھا۔ لہذا وہ

صحن کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھیں تو پھر انھیں صحن میں کسی کچڑ بھرے پیر کے نشان کا خیال کس طرح آ گیا

تاکہ حیرت زدہ ہو کر انھوں نے صحن کے فرش کی طرف دیکھا، تو وہاں کچڑ بھرا ایک نشان موجود تھا۔ اب تو ان کی

حیرت اور بڑھ گئی:

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے امی جان۔"

”بہت خوب؛ تب پھر میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔“  
 ”اور آپ کا اندازہ کیا ہے اُمی جان؟ فرزانہ نے بے گناہ انداز میں کہا۔

”یہ کہ ہمارے گھر میں اس وقت...“

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، اسی وقت دروازہ کی گھنٹی بجی تھی:

”انپکٹر جمشید آگئے۔“ جوبال نے فوراً کہا۔

ان کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔ خود جوبال اور اس کے ساتھ موجود لڑکی کے چہروں پر بھی حیرت، ہی حیرت نظر آئی:

”یہی بات ہم نے کسی تھی اباجان؟“ محمود مسکرایا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”اُل ٹھیک ہے۔“ انھوں نے کہا اور صحن میں آگئے، چند لمحے تک وہ آنے والے دونوں افراد کو باری باری دیکھتے رہے، آخر بولے:

”آپ میک آپ میں ہیں۔ اور میک آپ کے نیچے جیرال کا چہرہ میں صاف دیکھ سکتے ہوں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیا نہیں ہو سکتا؟ جیرال مسکرایا۔

”یہ کہ آپ جیرال ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ میک آپ در میک آپ میں ہیں۔“ وہ بولے۔

## اس کا نام

اب اس میک آپ کا کوئی فائدہ نہیں رہا۔ لیجیے۔ میں  
میک آپ اتار دیتا ہوں۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی جیرال نے میک آپ اتار دیا۔  
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔  
انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اوپر والے میک آپ سے پہلے ہم یہ خیال کر رہے تھے  
کہ آپ دوہرے میک آپ میں ہیں، لیکن اب ہمیں آپ  
کے چہرے پر میک آپ نظر نہیں آ رہا، لیکن اس کے  
بوجود آپ میں میک آپ ہیں۔ اس لیے کہ جیرال ہمارے  
ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔

”اگر آپ میرے چہرے پر میک آپ ثابت کر دیں تو میں  
آپ کو اپنا استاد مان لوں گا۔ آپ بے شک ماہرین کو بلا  
لیں۔ دُنیا کے بڑے سے بڑے ماہر کو بلا لیں۔“

”ہاں! یہ تو اب کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ ہم شدید  
الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔ مسلمان انسان کے اس دنیا  
میں دوبارہ آنے کو نہیں مانتا۔ یہ ہندوؤں کا عقیدہ  
ہے۔ کوئی اور مذہب بھی اس بات تو نہیں مانتا۔  
ایک امکان یہ ہے کہ آپ جیرال کے ہم شکل ہیں، لیکن  
اس حد تک شکلوں کا ایک ہونا بھی ذہن میں نہیں آتا۔“

لہذا ہم پہلے چیک کرائیں گے۔

یہ کہہ کر انپیکٹر جمشید فون کی طرف بڑھ گئے۔  
”ضرور چیک کرائیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ جیرال مسکرایا۔  
”ارے ہاں! اس لڑکی کے چہرے سے تو ہم نے میک  
آپ اتار ہی نہیں۔ فرزانہ۔ یہ کام تم کر ڈالو۔“  
”جی۔ بہت بہتر۔“

”نہیں۔ ایسا نہ کریں۔ جیرال نے فوراً کہا۔  
”کیا مطلب۔ ہم کیا نہ کریں؟ وہ حیران رہ گئے۔  
”اس لڑکی کے چہرے سے میک آپ نہ اتاریں۔“  
”لیکن کیوں؟“

”بس! میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا۔  
”ادہ! میں سمجھ گیا۔“ انپیکٹر جمشید فون کرنا بھول گئے اور  
ان کی طرف مڑے۔

”کیا سمجھ گئے آپ؟ جیرال نے چونک کر کہا۔  
”یہ کہ اس صورت میں ہم سازش کے رُخ کو سمجھ  
لیں گے۔“

”شاید یہی بات ہے۔“  
”تب پھر ہم اس لڑکی کا میک آپ ضرور اتاریں گے۔“  
”اس صورت میں جیرال آپ لوگوں کے راستے کی دیوار



بن جائے گا۔ جیرال سرد آواز میں بولا۔

”دیواریں گرانا ہم جانتے ہیں۔“

”میں جیرال ہوں۔ جیرال نے کھٹکھٹاتی آواز منہ سے نکالی۔“

”ہوں گے۔ ہم جیرال کو انھی ہاتھوں سے موت کے“

گھاٹ آتا دیکھے ہیں۔“

”تب پھر میں کس طرح آپ لوگوں کے سامنے موجود ہوں۔“

”اس کا جواب ہم اپنی نفیث کے بعد دیں گے۔“ محمود بولا۔

ادھر انپکٹر جمشید کسی کو فون کر رہے تھے۔ وہ سب بڑی ایک پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر جیرال ایک جھٹکے سے اٹھ

ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آخر انھوں نے دیوار رکھ دیا۔

اوز بولے :

”ماہرین جلد یہاں آ جائیں گے۔ اس سے پہلے مسٹر جیرال اپنی دیر سے شروع ہونے کی امید ہے۔ وہ ابھی شروع

آپ ہمیں اس سچی کا میک آپ آتارنے دیں۔“

”ہرگز نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

عین اس لمحے بیگم جمشید نے باورچی خانے کی کھڑکی کھول

ڈالی۔ انھوں نے دیکھا۔ صحن میں ایک جانا پہچانا آدمی

بیٹھا تھا۔

وہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ خوف ناک شکل صورت والا۔

آنکھیں اگرچہ پھوٹی تھیں، مگر ان میں بلا کی چمک تھی۔ ہونٹ

بھدے، سیاہ اور موٹے تھے۔ سر کے بال گہرے سیاہ

اور بہت گھنے تھے۔ ہاتھوں کی پشت اور بازوؤں پر بھی

بال ہی بال تھے۔ غرض پہلی نظر میں تو وہ خوف ناک لگتا

ہی تھا۔ بغور دیکھنے پر بھی جسم میں سنسنی کی لہر پیدا ہوتی تھی:

”آف خدا۔ یہ تو بالکل مسٹر جیرال ہیں۔“

”نہیں بیگم! یہ جیرال نہیں، اس لیے کہ اسے ہم نے اپنے

ہاتھوں سے ختم کیا تھا۔“

”تب پھر میں کس طرح آپ لوگوں کے سامنے موجود ہوں۔“

”اس کا جواب ہم اپنی نفیث کے بعد دیں گے۔“ محمود بولا۔

ادھر انپکٹر جمشید کسی کو فون کر رہے تھے۔ وہ سب بڑی ایک پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر جیرال ایک جھٹکے سے اٹھ

ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آخر انھوں نے دیوار رکھ دیا۔

اوز بولے :

”ماہرین جلد یہاں آ جائیں گے۔ اس سے پہلے مسٹر جیرال اپنی دیر سے شروع ہونے کی امید ہے۔ وہ ابھی شروع

آپ ہمیں اس سچی کا میک آپ آتارنے دیں۔“

”ہرگز نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

عین اس لمحے بیگم جمشید نے باورچی خانے کی کھڑکی کھول

ڈالی۔ انھوں نے دیکھا۔ صحن میں ایک جانا پہچانا آدمی

بیٹھا تھا۔

وہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ خوف ناک شکل صورت والا۔

آنکھیں اگرچہ پھوٹی تھیں، مگر ان میں بلا کی چمک تھی۔ ہونٹ

بھدے، سیاہ اور موٹے تھے۔ سر کے بال گہرے سیاہ

انداز میں سکرایا۔

”اور وہ کیا؟ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”یہ کہ۔ میں اپنا ہنچہ پیش کرتا ہوں۔ آپ بھی اپنا ہنچہ

نکال لیں۔ دونوں زور آزمائی کر لیتے ہیں۔ اگر میں جیت گیا

تو آپ بھی کا میک اپ اتارنے کا خیال دل سے نکال

دیں گے۔ ورنہ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔ اس طرح ہم

لاٹائی بھڑائی سے اپنے آپ کو بچالیں گے۔“

”بالکل ٹھیک۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی ہے۔“ انپکٹر

جمشید سکرائے۔

دونوں نے انگلیاں پھنساتیں اور اپنی اپنی طرف زور لگائے

لگے۔ دونوں نے ایٹری چوٹی کا زور لگا ڈالا، لیکن کوئی بھی

دوسرے کا ہاتھ نہ جھکا سکا۔ یہاں تک کہ دونوں کے جسم

پسینہ پسینہ ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ

آخر جیرال نے کہا:

”کیا خیال ہے۔ یہ مقابلہ برابر نہ چھوڑ دیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”تو پھر یہ مقابلہ برابر رہا۔“

دونوں نے ہاتھ الگ کر لیے۔

”اب یہ فیصلہ کیسے ہو کہ اس لڑکی کے چہرے سے ایک

آپ اترے گا یا نہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”فیصلہ ہونے میں سکا۔ لہذا صورت حال بچوں کی توں سے

یعنی میں میک اپ اتارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”فی الحال میں بھی جھگڑا نہیں چاہتا۔ کیونکہ نہ جانے آپ

کون ہیں اور کیا منصوبہ لے کر آئے ہیں۔ پہلے ہم آپ دونوں

کے بارے میں اپنا اطمینان کریں گے، پھر کوئی فیصلہ کریں

گے۔ یوں میں چاہوں تو اپنی عقل کے زور سے بھی اس

لڑکی کا نام جان سکتا ہوں۔“

”میرے خیال میں یہ ممکن نہیں۔“ جیرال سکرایا۔

”اچھی بات ہے۔ کیا آپ مجھے چند منٹ کے لیے اپنی

لائبریری میں جانے کی اجازت دیں گے؟“ انپکٹر جمشید بولے۔

”ضرور کیوں نہیں۔“

انپکٹر جمشید نے تینوں کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا، پھر

لائبریری کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی بولے:

”بیگم مہمانوں کے لیے کچھ تیار کیا یا نہیں؟“

”بہت کچھ تیار ہے۔ ان کی آواز سنائی دی۔“

”تو پھر ٹرے محمود کو تھما دیں نا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ پانچ منٹ

بعد وہ کمرے سے نکلے تو ان کے چہرے پر ایک پراسرار

”آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“  
 لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ بالکل اصلی جیرال ہیں۔  
 اصلی جیرال کے تو ہم نے ٹکڑے اڑا دیے تھے۔ پروفیسر  
 داؤد بولے۔

”یہ باتیں تو خیر بعد میں ہوں گی۔ پہلے تو یہ بتائیں۔  
 خان رحمان آپ کے ساتھ کیسے آ گئے۔“

”میں انھیں لے آیا ہوں۔ نہ جانے کیوں میرا جی چالا اور  
 میں نے اپنی گٹھڑی کا رخ ان کے گھر کی طرف موڑ دیا۔  
 سن لیا مسٹر جیرال؟“

”اُن بس لیا۔ اب معاملے کی بات ہو جائے۔“  
 ”ہائیں جمشید۔ تم بھی انھیں جیرال کہہ رہے ہو۔“

”فی الحال ہم انھیں اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب آپ  
 میک آپ صاف کرنے کی چیزیں لے آئے ہوں گے۔ مہربانی  
 فرما کر اپنا کام شروع کریں۔“

”اور آپ ان صاحبہ کا نام بتا رہے تھے۔“  
 ”اوہ اُن ! یہ بات تو رہی جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب اور

خان رحمان آپ ذرا اس بچی کو غور سے دیکھیں۔ یہ میک آپ  
 ہیں ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ دراصل کون ہے؟“

”بھلا ہم یہ بات کس طرح بتا سکتے ہیں۔ اُن ایسی باتیں

مکراہٹ ناپچ رہی تھی۔ ادھر مہمان کھانے پینے میں مصروف  
 تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ سن کر انھوں نے سر اٹھائے۔  
 ”میں نے اس بچی کے بارے میں ایک اندازہ قائم کیا  
 ہے۔ کیا آپ سننا پسند کریں گے؟“

”ضرور کیوں نہیں۔“ وہ بولا۔

”عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔  
 ”آا۔ پروفیسر انکل آئے ہیں۔“

”ساتھ ہی ایک بار پھر گھنٹی بجی۔“

”ارے ! انکل خان رحمان بھی ساتھ ہیں۔ اور یہ انھوں نے  
 اپنے حصے کی گھنٹی بجائی ہے۔“ فرزانہ چپکی۔

”پروفیسر داؤد کو تو آپ نے میک آپ چیک کرانے کے  
 لیے بلایا ہو گا، لیکن آپ نے خان رحمان کو کیوں بلایا۔  
 کیا آپ میرے خلاف یہاں طاقت جمع کر رہے ہیں؟ جیرال  
 نے چونک کر کہا۔

”ابھی دونوں اندر آ جاتے ہیں۔ تو خود ہی پوچھ لیجئے

”گاہ۔“ انیکٹر جمشید مسکرائے۔ اتنے میں محمود نے دروازہ کھول  
 دیا۔ وہ دونوں اندر آئے اور پھر ان کی نظریں جیرال پر  
 جم گئیں۔

”کمال ہے۔ اس قدر زبردست ہم شکل۔“ خان رحمان بولے۔



تم ضرور بتا دیتے ہو۔ لہذا بتاؤ۔ یہ کون ہے؟

”پہلے معاملہ سن لیں، کیا ہے۔ یہ بچی مسٹر جیرال کے ساتھ آئی ہے۔ جیرال بھی اس وقت میک آپ میں تھے، لیکن

ہم نے پہچان لیا۔ انھوں نے اپنا میک آپ اتار دیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے چہرے کو چیک کیا جائے۔ لہذا آپ

بلانا پڑا۔ اور ماہرین بھی آرہے ہیں۔ ایسے میں ہم اس بچی کا میک آپ اتارنا چاہا، لیکن مسٹر جیرال اڑ گئے۔

آخر یہ شرط طے پائی کہ ہم پنجہ آزمائی کر لیتے ہیں۔ ہم نے پنجہ آزمائی کی تو۔۔۔ انیکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

”تو کیا جمشید؟ خان رحمان پریشان ہو گئے۔

”ہم نے اڑی چوٹی کا زور لگا لیا، لیکن دونوں ایک دوسرے

کو شکست نہیں دے سکے۔

”کیا!! وہ ایک ساتھ چلائے۔

”ہاں! بالکل یہی بات ہے۔ اس کے بعد میں نے ان

سے کہا کہ اگر میں اپنی عقل کے ذریعے یہ بات معلوم کر

لوں کہ بچی کون ہے تو اس صورت میں تو انھیں کوئی اعتراض

نہیں ہو گا۔ مسٹر جیرال نے کہا کہ جہلا اس صورت میں یہ

کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس پر میں نے اپنی لائبریری میں

پانچ منٹ کے قریب وقت لگایا۔ اور میں نے جان لیا کہ

بچی کون ہے۔

”کیا کہا۔ تم نے جان لیا؟ خان رحمان بولے۔

”ہاں! میں جان چکا ہوں۔“

”تو پھر بتاؤ نا۔ یہ کون ہے؟“

”یہ انشارجہ کے وزیر خادجہ کی بیٹی پومی ہے۔“

”کیا!!“

جیرال بہت زور سے اُچھلا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں،

لیکن اس کے ساتھ محمود، فاروق، فرزاد، خان رحمان اور

پروفیسر داؤد بھی اُچھلے تھے۔

ہے۔ اور اس کا مطلب ہے۔ ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیے،  
 پروفیسر صاحب آپ اپنا کام شروع کریں۔

پروفیسر داؤد آگے بڑھے، ہی تھے کہ ایک بار پھر گھنٹی بجی:  
 ”یہ دوسرے ماہرین ہوں گے۔ جاد محمود، انھیں بھی  
 لے آؤ۔“

محمود ماہرین کو لے آیا۔ یہ تعداد میں شکل نو تھے۔ یہ  
 پروفیسر داؤد کے ساتھ مل کر جیرال کے چہرے پر کام کرنے  
 لگے۔ ایک گھنٹے کی سر توڑ کوشش کے بعد انھوں نے فیصلہ دیا:  
 ”یہ صاحب میک آپ میں نہیں ہیں۔ دُنیا کا کوئی ماہر انھیں  
 میک آپ میں ثابت نہیں کر سکتا۔“

”اُف مالک۔ جیرال کو تو ہم نے بالکل ختم کر دیا تھا۔  
 اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیا گیا تھا کہ جیرال  
 بالکل ختم ہو چکا ہے۔ کبھی دوبارہ سامنے آنے کے  
 قابل نہیں رہا۔ لیکن یہ تو ایک بار پھر سامنے ہیں، اب  
 ہم کیا کریں؟“

”کونا کرانا کیا ہے۔ ان سے پوچھیں۔ یہ کیا چاہتے ہیں،  
 ہمارے گھر آنے کا ان کا مقصد کیا ہے؟“ فرزانہ بولی۔

بالکل ٹھیک۔ مسٹر جیرال! فی الحال ہم مان لیتے ہیں کہ  
 اب آپ میک آپ میں نہیں ہیں اور آپ اصلی جیرال ہی

## پہلا وار

”یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ خان رحمان بولے۔

”ہونے کو اس دُنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔“ انسپکٹر جمشید  
 نے مسکرا کر کہا۔

”یہ۔۔۔ یہ جملہ آپ نے کہا ہے آبا جان؟“

”ہاں کیوں۔ کیا یہ صرف تم کہہ سکتے ہو؟“

”لیکن یہ بات پلے نہیں پڑی۔ مسٹر جیرال انشارجہ کے

لیے کام کر سکتے ہیں۔ یہ اصلی ہیں یا نقلی، اس بات کو

پھوڑتے ہوئے۔ لیکن انشارجہ کا وزیر خارجہ اپنی بیٹی کو بھلا

ان کے ساتھ کیوں بھیجنے لگا اور اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے

”بھئی اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ

کہ مسٹر جیرال اس مرتبہ انشارجہ کے لیے کام کر رہے

ہیں۔ اور دوسری یہ کہ مہم اس قدر خاص ہے کہ انشارجہ

کے وزیر خارجہ نے اپنی بیٹی تک کو مہم میں جھونک دیا

۔۔۔

ہوں۔ لیکن یہ ہیں دوسرے جیرال۔ وہ جیرال نہیں۔  
آپ کا مطلب ہے۔ ہم شکل جیرال: محمود نے کہا۔  
ہاں! یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ  
بات کوئی اور ہو۔

شکریہ انیکٹر جمشید۔ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔  
اور دوسری ملاقات آپ کو بہت عرصہ تک یاد رہے گی۔  
ہم جا رہے ہیں۔

دونوں اٹھ کر دروازے کی طرف چلے۔ عین اس وقت  
دروازے کی گھنٹی بجی، وہ چونک اٹھے۔  
یہ۔ اب کون صاحب آگئے؟

دیکھ لیتے، میں۔ انیکٹر جمشید یہ کہہ کر خود آگے بڑھے۔  
انہوں نے دروازہ کھولا۔ باہر ان کے ملک کے وزیر  
خادمہ عابد جیلانی کھڑے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر حیرت زدہ  
رہ گئے۔

سر آپ۔ خیر تو ہے۔ آپ مجھے بلا لیتے۔

نہیں۔ مجھے آنا پڑا۔ بہت اہم معاملہ ہے۔

ایک منٹ سر۔ پہلے میں ان دو مہمانوں کو رخصت  
کریں۔ آپ اندر تشریف لے چلیے۔ بھئی پروفیسر صاحبہ  
جیلانی صاحب کو بٹھاتیے۔

میں۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کس لیے آئے ہیں؟

میں اور پومی جا رہے ہیں۔ فی الحال آپ کو صرف اور صرف  
یہ بتانے آئے تھے کہ ہم یہاں آگئے ہیں۔ اپنا بچاؤ  
سکتے ہیں تو کر لیں۔

بچاؤ۔ آپ سے؟ انیکٹر جمشید بولے۔

ہاں! مجھ سے۔ میں چوری چھپے وار کرنے کا عادی نہیں  
ہوں۔ یہ بات آپ جانتے ہیں۔ لہذا جان لیں۔ میں  
اعلان کر رہا ہوں۔ آپ اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں تو کر لیں۔  
میں وار کروں گا۔ اور جیرال کا وار کوئی عام وار نہیں ہو  
گا۔ اس نے کہا۔

اچھی بات ہے مٹر جیرال۔ آپ کی بہادری اور آپ کے  
با اصول ہونے کو ہم پہلے ہی سب جانتے ہیں۔ اور ہم اپنا  
بچاؤ کریں گے۔

شکریہ! یہ کہہ کر جیرال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کیا آپ انہیں جانے دیں گے؟

ہاں! اس لیے کہ یہ ہمارے ہاں مہمان ہیں۔ دوسرے  
یہ کہ ابھی انہوں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا۔ جس جیرال  
نے جرم کیے تھے۔ ہمارے ملک کو نقصان پہنچائے  
تھے۔ اسے ہم ختم کر چکے ہیں۔ یہ چاہے میک آپ میں



”آئیے سر۔“ پردیسر فوراً بولے۔

”ادھو۔“ پردیسر داؤد صاحب۔ آپ بسا، موجود ہیں۔“

لیکن یہ شخص ملک اور قوم کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”اگر ان صاحب نے ایسی کوئی حرکت کی تو ہم بھی خیر نہیں ہیں۔“

”جی ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔ اور یہ میرے ساتھ خان رحمان بھی آئے ہیں۔“

”خیر۔ یہ آپ کا کام ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”ادھو۔ ارے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ ایسے میں جیلانی صاحب

کی نظر حیرال اور پومی پر پڑی۔

”کیا آپ انھیں پہچانتے ہیں سر؟“

”میں اس لڑکی کو تو نہیں جانتا۔ لیکن یہ حضرت

حیرال لگتے ہیں۔ لیکن حیرال تو آپ لوگوں کے ہاتھوں

جا چکا ہے۔“

”جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی

شک نہیں کہ یہ حضرت بالکل حیرال نظر آتے ہیں۔“

”اور آپ انھیں رخصت کر رہے ہیں۔ گرفتار کیوں نہیں

کرتے۔“ وزیر خارجہ بولے۔

”ابھی انھوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”لیکن کر تو سکتے ہیں۔“

”جرم سے پہلے میں کسی کو گرفتار کرنے کا قائل نہیں۔ اور

جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس وقت تک بھی

گرفتار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”کیا ضرورت ہے۔“ جیلانی صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

”باقی لوگ مسکرا دیے۔ وہ انپکٹر جمشید کو اچھی طرح جانتے

تھے۔ ان کی یہ بھاگ دوڑ بلا وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔“

لے کر تجربہ گاہ کی طرف جاؤ۔ بلکہ خان رحمان تم اپنے گھر جاؤ۔  
ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیں گے۔ جلدی کرو۔ اٹھ اپنا رحم فرمائے۔  
انہوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ہاں! اب آپ فرمائیں۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"  
"میں پختہ راز سے اپنے گھر میں بہت پر اسرار سی نقل و  
حرکت محسوس کر رہا ہوں۔ کوئی رات کے وقت پوری کوشش میں  
گھومتا پھرتا ہے۔"

"آپ نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟"

"بہت کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اٹھ نہیں آتا۔ چھلاؤ  
ہے۔ چھلاؤ۔ اس وقت تک میرے تین ملازم بری طرح زخمی ہو  
چکے ہیں۔"

"کیا آپ کی کوشش کے باہر پولیس نہیں ہوتی؟"

"ہوتی کیوں نہیں۔ لیکن پولیس بھی اسے نہیں پکڑ سکی۔ اور  
اس کی بے خونی کا یہ عالم ہے کہ وہ برابر کوشش میں چلتا پھرتا  
نظر آتا ہے۔"

"خیر۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ آج رات میں اور میرے  
بچے آپ کی کوشش میں گزاریں گے۔"

"بہت خوب! یہ ہوئی بات۔ تو پھر اب میں چلتا ہوں۔"  
"ہاں! آپ بے فکر رہیں۔"

انپکٹر جمشید دروازے پر پہنچے، لیکن حیران کا دور دورہ نہ  
پتا نہیں تھا۔ اب انہوں نے رومال کا بغور جائزہ لیا۔  
اور بری طرح اچھلے۔ فوراً واپس پلٹے۔ اور ڈرائنگ روم  
میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے پروفیسر داد سے کہا  
"اس رومال کو دیکھیے ذرا۔ جلدی سے۔"

"جو نہی پروفیسر داد نے رومال لے کر دیکھا، زور سے  
اچھلے۔ نہ صرف اچھلے، بلکہ باہر کی طرف دوڑ لگا دی اور  
پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔"

"خدا ہو گئی۔ انپکٹر جمشید کی بھاگ دوڑ کیا کم تھی کہ اب پروفیسر  
صاحب بھی دوڑ پڑے۔"

سب ان کا انتظار کرتے رہے، لیکن جب پانچ منٹ  
تک بھی پروفیسر صاحب کی واپسی نہ ہوئی تو مارے حیرت  
کے ان کا بُرا حال ہو گیا۔ اب تو وہ سب باہر نکل گئے  
لیکن دروازے کے باہر پروفیسر داد کا دور دورہ نہ پتا نہیں  
"اس کا مطلب ہے۔ کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اور حیران  
اپنا پہلا وار کر گیا ہے۔" انپکٹر جمشید بڑبڑاتے، پھر بولے۔

"آؤ۔ ہم بھی تجربہ گاہ کی طرف چلتے ہیں۔"

"اور میں جو کچھ بات کرنے آیا تھا۔ وزیر خارجہ بولے۔  
"اوہ ہاں۔ اچھا تم تینوں اپنے انکل خان رحمان کو ساتھ

اب ان کی کار ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ یہ بات بھی بھول چکے تھے کہ پروفیسر داؤد اور باقی سب لوگ تجربہ گاہ کی طرف دوڑ لگا چکے تھے۔ اس وقت وہ صرف اور صرف اس عورت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اس لیے کہ اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

ماڈل کالونی میں ۹۶ جی ایل تلاش کرنے میں انھیں چند منٹ لگے۔ یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت کوشی تھی۔ دروازے پر نام کی تختی پر صولت بیگ روزنامہ قوم لکھا تھا۔ کوشی کا گیٹ کھلا پڑا تھا۔ وہ فوراً کار اندر لے گئے۔ کار سے اتر کر اندرونی دروازے کی طرف پلکے۔ دروازے پر ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ کھل گیا۔ پھر بھی انھوں نے پہلے گھنٹی بجائی۔ جلدی جلدی تین بار گھنٹی بجانے کے بعد آخر وہ اندر داخل ہو گئے اور پھر دھک سے رہ گئے۔

فرش پر ہر طرف خون ہی خون پھیلا تھا۔ گھر کی تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے زبردست ہنگامہ ہوا ہے۔ الماریاں اور سیف وغیرہ سے تمام چیزیں نکال نکال کر ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ گویا حملہ آوروں کو کسی چیز کی تلاش بھی تھی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔

وہ انھیں رخصت کرنے دروازے تک آئے۔ مگر جانے کے بعد دروازہ بند کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی :  
"معلوم ہوتا ہے۔ جیرال اب ہمیں سانس نہیں لینے دے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی :  
"ہیلو۔ یہ انیکٹر جمشید کا گھر ہے نا؟  
"جی ہاں! انیکٹر جمشید بات کر رہے ہوں۔"  
"شکریہ انیکٹر صاحب۔ آپ فوراً یہاں آجائیں۔ کام بہت خراب ہے۔"

اسی وقت الفاظ کا سلسلہ رک گیا۔ اور فون بند ہو گیا۔ انیکٹر جمشید نے فوراً ایکس چیج مکنے نمبر ڈائل کیے اور بولے :  
"انیکٹر جمشید بات کر رہے ہوں۔ ابھی ابھی میرے نمبر پر کس نمبر سے بات ہو رہی تھی۔ میں وہ نمبر اور اس کا پتا جانا چاہتا ہوں۔"

"او کے سر۔ ابھی بتاتا ہوں۔"  
ایک منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی :  
"آپ کو فون ۲۶۵۶۷۴ سے کیا گیا ہے۔ پتا نوٹ کر لیں ۹۶ جی ایل ماڈل کالونی۔"  
"شکریہ! انھوں نے کہا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔



”جی نہیں جانتا ہوں گا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“  
 ”شکریہ! تو پھر بتائیے۔ آپ کے پڑوسی کون ہیں۔“

”کیا کہتے ہیں؟“

”یہ بات تو ان کی نیم پلیٹ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اور پھر آپ براہ راست ان سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“ ادھیڑ عمر نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔

”اس لیے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔“

”تو ان کی بیوی تو گھر میں ہو گی نا؟“

”جی نہیں۔ وہ بھی نہیں ہیں۔“

”اوہو اچھا۔ خیر۔ آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کیوں؟“

”منز صولت نے تھوڑی دیر پہلے مجھے فون کیا تھا، لیکن

فدا، اسی کسی نے فون کے تار کاٹ دیے۔“

”جی کیا مطلب؟ وہ چونکا۔“

”اب میں یہاں پہنچا ہوں تو گھر کا دروازہ کھلا پڑا ہے اور

اندھ خون پھیلا ہوا ہے۔“

”نہیں۔ نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس نے خوف زدہ

ہو کر کہا۔“

”آئیے میں آپ کو دکھا دیتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ پولیس تو مجھے دھمکے گی۔“

اب انھوں نے باہر نکل کر فرش کا جائزہ لیا۔ ایک کار کے تازہ نشانات موجود تھے اور دو آدمیوں کے گھیسٹے جانے کے نشانات بھی موجود تھے۔ گویا گھر کے افراد کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا تھا اور پھر انھیں کار میں ڈال کر یہاں سے لے جایا گیا تھا۔

ایک بار پھر وہ اندر گئے۔ فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے۔ ساری بات ان کے ذہن میں واضح ہو گئی۔ گھر کے افراد نے مدد کے لیے انھیں فون کیا، لیکن فون کے تار کاٹ دیے گئے، اس کے بعد وہ انھیں اغوا کر کے لے گئے۔ سوال یہ تھا کہ حملہ آور گھر کے افراد سے کیا چاہتے تھے۔

کوٹھی سے باہر نکل کر انھوں نے اکرام کو فون کیا۔ اسے ہدایات دیں اور پھر ساتھ والی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکلا۔

”جی فرمائیے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”آپ اپنے دائیں طرف والے پڑوسی کے بارے میں کچھ

باتیں جانتے ہیں؟“

”جی کیا مطلب۔ بھلا ساتھ والے پڑوسی کے بارے میں

"نہیں۔ پولیس آپ کو گرفتار نہیں کرے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بس مجھے صولت بیگ کے بارے میں بتائیں۔"

"وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ صفا ہیں۔ سنا ہے روزانہ"

قوم کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نہ تو بکنے والے ہیں، نہ جھکنے والے۔ بڑے بڑوں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا کام ہے۔ ملک اور قوم کے خلاف جو بھی بڑا آدمی کوئی کام کرتا نظر آ جاتا ہے، اسی کے خلاف اپنے اخبار میں چھاپ دیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے بے شمار دشمن بنائے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی کوئی دشمن آج یہاں سے رہ گیا ہو۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس نے جلدی کیا۔

جی۔ انھیں انپکٹر جمشید کہتے ہیں۔

"کیا! اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔"

انپکٹر جمشید اکرام کے ساتھ اندر آئے تو اکرام بھی دھک

پئے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی کوئی دشمن آج یہاں سے رہ گیا ہو۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس نے جلدی کیا۔

آف مالک! یہ کیا ہوا؟

"صولت بیگ کے بارے میں کچھ جانتے ہو اکرام؟"

"کچھ نہیں۔ بہت کچھ۔ اس قسم کے محب وطن لوگ"

وہ دلاں سے پلٹے، ہی تھے کہ اکرام کی جیب آتی بہت کم ہوتے ہیں۔"

نظر آئی۔ اس کے پیچھے پولیس بھی تھی۔ پڑوسی نے بھی

پولیس کی گاڑیوں کو آتے دیکھا تو دروازے پر ہی رک جاتا ہو؟

گیا۔ پھر جو اکرام نے جیب سے اتر کر انپکٹر جمشید کے

سلوٹ کیا اور دوسرے پولیس والے بھی سلوٹ مارتے نظر

آئے تو وہ حیران ہوئے۔ بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ وہ اس

سے اس قدر نرم آواز میں باتیں کرتے رہے تھے کہ

ہے کہ اس کے بے شمار دشمن ہیں! اس نے بتایا۔

یہ کہ کر وہ فون کرنے کے لیے باہر نکلے ہی گئے تھے۔ انہوں نے ایک سادہ لباس والا دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کا راج تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کوئی بہت خوف ناک چیز دیکھی ہے۔

اکرام کے ماتحت اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ انہوں نے نشانات اٹھائے، المادیوں کے دروازوں سے بھی نشانات لیے گئے۔ حملہ آوروں نے ہاتھوں دستانے نہیں پہن رکھے تھے۔ لہذا ہر جگہ سے نشانات گئے۔

”بے چارے کی بیوی کو بھی اٹھا لے گئے۔ یہ بہت برا ہے اکرام۔ اور میں اغوا کرنے والوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کام جیرال کا ہے؟“

”نہیں۔ جیرال اور طرح کا مجرم ہے۔ وہ ایسے کام نہیں کرتا۔ بلاوجہ خون خرابہ نہیں کرتا۔ اگر اس کا کام خون خرابے کے بغیر چل سکتا ہے تو وہ ہرگز ایسے کام نہیں کرے گا۔“

”لیکن یہ وہ جیرال تو ہے نہیں۔ وہ تو مارا گیا تھا۔“

”ہاں! یہ وہ جیرال نہیں ہے۔ تو پھر یہ کون ہے؟“

میرا خیال ہے اس کام کے لیے ہمیں انپکٹر کامران مرزا کی ڈیوٹی لگانا پڑے گی، کیونکہ ہم اس طرف الجھتے نظر آتے ہیں۔

نے کہا۔

”یس سر۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“

”میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔“



لگتا تھا، جیسے وہ ہوش میں تو ہیں، لیکن نہ بول سکتے ہیں۔  
— بل سکتے ہیں۔

انکل — یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ ہوش میں ہیں  
یا بے ہوش ہیں۔ اگر ہوش میں ہیں تو بات کیوں نہیں  
کرتے اور اگر بے ہوش ہیں تو آپ کی آنکھیں کیوں کھلی  
ہیں۔ یہ کیسی بے ہوشی ہے؟ محمود نے جلدی جلدی کہا۔

”بمیر اسرار بے ہوشی“ فاروق نے فوراً کہا۔

”میرا خیال ہے۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔ ارے ہاں!  
ہم اس رومال کو تو بھول ہی گئے۔ ایسا لگتا ہے۔

میرے یہ رومال لے کر یہاں پہنچے ہی تھے کہ بے ہوش ہو

گئے، اس رومال کے بارے میں یہ اپنے کسی اسٹنٹ

سے بات نہیں کر سکے۔ پہلے یہ رومال کسی اسٹنٹ

کے حوالے کر دینا چاہیے۔

بالکل ٹھیک۔

اب انھوں نے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر

دنگ دی۔ اس میں ان کے اسٹنٹ کام کرتے تھے۔

پانی کمروں میں بھی دوسرے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف

تھے۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان آدمی کا چہرہ نظر آیا:

”اے آپ! یہ آپ لوگ ہیں۔ اس نے چہک کر کہا۔

## بمیر اسرار بے ہوشی

محمود، فاروق اور فرزانہ آدمی اور طوفان کی طرح تجربہ گاہ میں  
پہنچے۔ دروازہ کھلا تھا، وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔

انھوں نے دیکھا، پروفیسر داؤد اپنی کرسی میں دھنسے ہوئے

تھے اور بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ وہ رومال ان کی میز

پر موجود تھا۔

”پروفیسر انکل — کیا ہوا، خیر تو ہے؟“

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب تو وہ گھبرا گئے۔

آگے بڑھے اور انھیں شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ اتنے میں

شانہ بھی آگئی۔ وہ بھی اپنے والد کو اس حالت میں دیکھ

کر پریشان ہو گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کھلی

ہوئی تھیں۔ اور جسم ساکت تھا۔ اب تو ان کے ہوش

اڑ گئے۔ جلدی جلدی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی۔

دل حرکت کر رہا تھا اور نبض بھی چل رہی تھی۔ یوں

ہوئے۔ اور سیدھے پروفیسر داؤد کی طرف بڑھے۔ انھوں نے پروفیسر صاحب کا معائنہ شروع کیا، لیکن جلد ہی انھوں نے جان لیا کہ ان کی بے ہوشی کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آخر وہ خود ہی بولے :

”میں نہیں سمجھ سکا۔ انھیں ہسپتال لے کر جانا پڑے گا۔ میں ایبولینس کو فون کرتا ہوں۔“

جیرال نے گویا اپنا کام بھرپور طریقے سے شروع کر دیا ہے۔ ہمیں ہر طرف سے الجھا دینا، یہ اس کا پرانا طریقہ ہے۔ خیر...

یعنی اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی :

”یہ ایسے ہیں کون آگیا۔ شائستہ۔ ذرا تم ہی دیکھ لو۔“

محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

”بہت اچھا! شائستہ نے فوراً کہا اور دوڑ گئی۔ جلد ہی

لوٹی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان آدمی تھا :

”یہ انکل خادم گرمانی ہیں۔“

خادم گرمانی۔ کیا مطلب؟ فرزانہ چونکی۔

ابو کے دوست ہیں۔ پہلے بھی ان سے ملنے کے لیے آتے رہے ہیں۔“

اوہ اچھا۔ لیکن گرمانی صاحب۔ آپ اس وقت ان سے

ہاں! ہم ہی ہیں، لیکن یہ پروفیسر صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”آئیے جلدی کریں۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔“

”بالکل نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ہاں سے واپس آچکے ہیں۔ جاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آپ کے ہاں جا رہے ہیں۔“

”اوہ۔ وہاں سے یہ اس رومال کو لے کر دوڑے تھے۔ آپ سب سے پہلے اس رومال کو دیکھ لیں۔“

”کگ۔ کیسا رومال؟“ اس نے گھبرا کر کہا اور پھر جلدی سے محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

یہ پروفیسر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کی نظروں میں خوف سمایا، اس کی آنکھوں میں خوف سمایا، اس نے رومال اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔

”آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔ یہ رومال خطرناک ہے۔ وہ رک گئے۔ ادھر اسٹنٹ نے کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی

کر لیا۔ محمود نے فوراً فون کا رسیوڈ اٹھایا اور ڈاکٹر فضل کے نمبر گھمائے۔ پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر فضل اندر داخل

ہوئے۔

نہیں مل سکتے، اس لیے کہ یہ اس وقت بے ہوش ہیں۔

”اوہ اچھا۔ لیکن انہیں ہوا کیا ہے؟“  
”یہ تو ابھی ڈاکٹر صاحب نہیں جان سکے۔ ہم کیسے  
سکتے ہیں۔“

”اوہ! تب تو انہیں ہسپتال لے جانا ہوگا۔ میرے پاس  
بڑی گاڑی ہے۔ اس پر لے چلتے ہیں۔“

”میں نے ایمبولینس کے لیے فون کر دیا ہے۔ وہ آتی ہی ہے۔  
گی۔ یہ اس میں آرام سے جائیں گے، گاڑی میں انہیں رکھیں  
ہوگی۔“ ڈاکٹر فضل نے کہا۔  
”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔“

”میں ذرا یہ دیکھ لوں۔ اس رومال کے بارے میں  
معلوم ہوا یا نہیں؟“ محمود نے بے تابانہ انداز میں کہا۔  
”رومال۔ کیسا رومال؟“ خادم گرمائی نے کہا۔  
”پہلے تو آپ بتائیں۔ آپ کیسے تشریف لائے؟“  
”مذہ بنایا۔“

”بروفیسر صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ ان کا دوست  
ہوں۔ جیسا کہ شائستہ نے بتایا ہے۔“

”آپ کا فون نمبر کیا ہے؟“ فرزانہ بولی۔  
”کیوں آپ کو میرے فون نمبر کی کیا ضرورت پڑگئی؟“

”میں خادم گرمائی صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔  
وہ تو میں یہاں کھڑا ہوں۔“ خادم گرمائی فوراً بولا۔

”شائستہ۔ اپنے انکل گرمائی کا نمبر بتا سکتی ہو؟“ فرزانہ نے  
جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

”ہاں! کیوں نہیں۔ ان کا نمبر ۳۹۴۹۴۹ ہے۔“

فرزانہ فوراً فون کی طرف بڑھی۔ اوہ جلدی جلدی یہ نمبر  
کھما ڈالے:

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“ گرمائی نے جھلّا کر کہا۔

”آپ ذرا خاموش رہیں۔ ہم اس وقت پُر اسرار ترین حالات  
سے دوچار ہیں۔“ محمود نے بھنّا کر کہا۔

”بالکل غلط۔“ فاروق مسکرایا۔

”کیا غلط بات کہہ دی میں نے؟“ محمود اس پر اُلٹ پڑا۔

”یہ کہ ہم اس وقت پُر اسرار ترین حالات سے دوچار  
ہیں۔“ جی نہیں۔ ہم دوچار نہیں۔ چار آٹھ ہیں۔“ فاروق

”جی نہیں۔ ہم دوچار نہیں۔ چار آٹھ ہیں۔“ فاروق

”مذہ ہوگئی۔“ محمود نے تپلا کر کہا۔

”میں اس وقت سلسلہ مل گیا۔“

”اسلام علیکم۔“ یہ خادم گرمائی کا نمبر ہے نا؟

”جی ہاں! فرمائیے۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔“

”میں خادم گرمائی صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ تو میں یہاں کھڑا ہوں۔“ خادم گرمائی فوراً بولا۔



”جی وہ یہاں نہیں ہیں۔“ پروفیسر صاحب کے ہاں گئے۔  
 ہوئے ہیں۔“ اس طرف سے کہا گیا۔

”ادہ اچھا۔ بہت بہت شکریہ۔“ یہ کہ کر فرزانہ نے دسوا  
 دکھ دیا۔

”معاف کیجیے گا گرمائی صاحب۔ دراصل میں شک میں  
 مبتلا ہو گئی تھی کہ آپ خادم گرمائی ہیں بھی یا نہیں۔ اب  
 جب کہ تصدیق ہو گئی ہے۔ ہمیں کوئی شک نہیں رہا۔“  
 ”آپ۔ آپ بہت ذہین ہیں۔“ خادم گرمائی نے اس کی  
 تعریف کی۔

”شکریہ۔ آپ تشریف رکھیں۔“

”عین اس وقت باہر ایبولینس کی آواز سنائی دی، پھر سڑک  
 لیے چار آدمی اس کمرے تک آئے۔ اور پروفیسر داؤد کو  
 اس پر لٹ کر لے چلے۔“

”ہم ساتھ جا رہے ہیں؟“ محمود بولا۔

”لیکن محمود بھائی۔ آپ نے اب تک ساتھ والے کمرے  
 سے رومال کے بارے میں معلوم نہیں کیا۔“ شائستہ نے کہا۔

”ارے دھت تیرے کی؟“ اس نے جھٹاکر اپنی ران پر  
 ہاتھ مارا۔ اور پھر اس کمرے کی طرف دوڑا۔ دروازے پر  
 دستک دی۔ ایک منٹ بعد دوسری دستک دی، پھر تیسری  
 ”ارے باپ رے۔“ یہ رومال تو حد درجے خطرناک ہے۔

لیکن اندر حرکت کے کوئی آثار نظر نہ آئے؛

”ارے باپ رے۔“ ڈاکٹر صاحب۔ آپ پروفیسر صاحب  
 کو خود ہسپتال لے جائیں۔ ہم ذرا اس کمرے کو دیکھ لیں،  
 پتا نہیں، کیا چکر شروع ہو گیا ہے؟

”آخر یہ رومال کا کیا چکر ہے؟“ گرمائی نے کہا۔

”آپ کو شائستہ سے ساری بات معلوم ہو جائے گی۔“  
 ”ادہ اچھا۔ خیر۔“

”لیکن اب ہم اس کمرے کے دروازے کا کیا کریں؟“ محمود  
 نے کہا۔

”دروازہ توڑ دیتے ہیں۔“

”اگر ایسا ضروری ہے تو یہ کام میں کیے دیتا ہوں۔ توڑ پھوڑ،  
 بوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ میرے شغلے ہیں۔“  
 ”آئیے پھر۔ آپ ہی توڑیے۔“

اور اس نے ایک زبردست ٹکڑ دروازے پر ماری، ساتھ  
 ہی دروازہ ٹوٹ کر دوسری طرف گرا۔ وہ فوراً اندر داخل  
 ہوئے۔ دوسرے لمحے وہ دھک سے رہ گئے۔

اندر پروفیسر داؤد کے پانچ اسٹنٹ بالکل انہی کے انداز  
 میں بے ہوش پڑے تھے؛

”ارے باپ رے۔“ یہ رومال تو حد درجے خطرناک ہے۔

”بس! اس حد تک میں کام آگیا۔ اب یہاں میرے لائق  
اور کوئی کام نہیں نظر آیا۔“  
”آئیے اٹکل۔ ہم اس طرف بیٹھتے ہیں۔ میں آپ کو  
بتاتی ہوں۔“

دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کچھ  
فاصلے پر بیٹھے رہے۔ انھیں اب مزید ایمبولینسوں کا انتظار تھا:  
”کچھ اندازہ لگایا؟ محمود نے ان کی طرف دیکھا۔“

”میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔“ فرزانہ نے  
دہلی آواز میں کہا۔ اس کا اشارہ خادم گرمائی کی طرف تھا۔  
یعنی اس وقت خادم گرمائی نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ وہ  
حیرت زدہ رہ گئے، کیونکہ فرزانہ کی آواز اس قدر آہستہ تھی کہ  
اتنے فاصلے پر بیٹھا ہوا شخص کسی صوت بھی نہیں سن  
سکتا تھا، جب کہ اس کے دیکھنے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا  
تھا جیسے اس نے یہ جملہ بالکل صاف سنا ہو۔

”آپ کس لیے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں؟ فرزانہ نے دھک  
دھک کرتے دل کے ساتھ کہا۔“

”میں نے آپ کا جملہ سن لیا ہے۔ آپ میرے بارے میں  
کچھ نہیں جانتی ہیں، جب کہ شائستہ نے میرا تعارف کرا دیا ہے اور آپ  
نے فون کر کے میرے بارے میں تصدیق کر لی ہے۔ لیکن خیر۔“

اس قدر خطرناک کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پہلے تو اس رومال کو  
اگ لگا دینی چاہیے۔“ محمود جلدی جلدی بولا۔

”اگ لگانے کی بجائے اس کو کسی کمرے میں بند کر دیتے ہیں  
شاید اس سے کوئی زہریلی شے نکل رہی ہیں۔“ فرزانہ نے  
خیال ظاہر کیا۔  
”ٹھیک ہے۔ ایسا کر لیتے ہیں۔“

محمود نے رومال کو اٹھایا۔ سانس بند کیا اور اس کو ایک  
کمرے میں ڈال کر دروازے کو تالا لگا دیا:

”اب ان حضرات کو بھی ہسپتال لے جانا ہوگا۔“ ڈاکٹر  
صاحب آپ ایک فون ان کے لیے بھی کر دیں اور پروفیسر صاحب  
کو لے جائیں۔ اب ہم یہیں ٹھہریں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“ ڈاکٹر فضل فون کی طرف بڑھ گئے۔ فون  
کرنے کے بعد وہ نیچے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔  
”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟“

”شائستہ! تم مجھے تھوڑی بہت تفصیل سنا دو، پھر میں تو  
چلتا ہوں۔“ میرا خیال ہے۔ میں اور کوئی کام نہیں آ  
سکوں گا۔“

”نہیں خیر۔ آپ تو بہت کام کے آدمی ہیں۔ ایک ٹکر میں  
اتنا مضبوط دروازہ توڑ ڈالا۔“ محمود مسکرایا۔

کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں فرزانہ کی آواز گونج اٹھی۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”ہمارا خیال ہے کہ آپ خادم گرمائی نہیں ہیں۔ کیا آپ ہمیں  
 اپنے چہرے کا معائنہ کرنے کی اجازت دیں گے؟“  
 ”کیوں۔ میرے چہرے کو کیا ہوا؟“  
 ”بس۔ دیکھیں گے ہم۔“  
 ”تو ضرور دیکھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔  
 تینوں ایک ساتھ اس کے چہرے پر جھک گئے۔

آپ ضرور میرے بارے میں الجھن میں رہیں۔ بھلا میں اس میں  
 کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ کے کان بلا کے تیز ہیں۔ اس قدر تیز کان تو شاید  
 ہماری بہن کے بھی نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب۔ کیا ان کے کان اس قدر تیز ہیں؟“ خادم گرمائی  
 کے لہجے میں حیرت تھی۔

”لیکن آپ جتنے نہیں؟“

”اس میں شک نہیں کہ میرے کان بہت تیز ہیں۔ ہاں تو  
 شائستہ تم کیا کر رہی تھیں؟“

انھوں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں :

”اب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کریں گے۔“ محمود نے  
 اشاروں میں کہا۔

”ہاں! بالکل ٹھیک۔ پھر دیکھیں گے کہ یہ حضرت کیسے ہماری  
 باتیں سن لیتے ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

اسی وقت خادم گرمائی اٹھ کر کھڑا ہو گیا :

”اچھا شائستہ بہت بہت شکریہ۔ اب میں چلوں گا۔“  
 ”شکریہ انکل۔ شائستہ نے کہا۔

خادم گرمائی دروازے کی طرف بڑھا :

”ایک منٹ جناب۔ ہم آپ کے بارے میں اپنا اطمینان



## میں جا رہا ہوں

"کیا بات ہے بھئی۔ خیر تو ہے؟"

"اندر۔ سر۔ ایک غسل خانے میں۔ اس نے کانپ کر کہا۔"

"کیا مطلب؟ وہ بولے۔"

"آئیے سر۔ میں بتا نہیں سکتا۔ اس نے کانپ کر کہا۔  
دونوں اس کے ساتھ پکے اور غسل خانے تک گئے۔"

اند کا منظر دیکھ کر ہی ان کے دل الٹ سے گئے۔ ایک عورت کی گردن دھڑ سے الگ پڑی تھی، غسل خانے میں خون تھا۔

"حیرت ہے۔ یہ لاش، ہمیں اب کیوں نظر آئی؟" انیسٹر جمشید بولے۔

"کک۔ کیا مطلب؟ اکرام چونکا۔"

"بھئی میں پورے مکان کا جائزہ لے چکا ہوں اور میں

یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس غسل خانے کو بھی دیکھا۔ جانتے ہو اکرام اس بات کا کیا مطلب ہے؟

"یس سر۔ قاتل اس وقت گھر میں موجود تھا۔ اور" نے اس عورت کا منہ لاتھ رکھ کر بند کر رکھا تھا۔ تاکہ

آواز نہ نکال سکے۔ اور وہ اس وقت ایک کمرے سے دوسرے میں حرکت کر رہا تھا۔ یعنی نظروں سے پکڑنے کے لیے۔ پھر

آخر کار اس نے اس غسل میں اس غریب کو ہلاک کر دیا۔ یہ ضرور صولت بیگ کی بیوی ہے۔"

"ہاں اکرام! اسی نے مجھے فون کیا ہو گا۔ ہمیں قاتلوں تک جلد از جلد پہنچ جانا چاہیے، کیونکہ وہیں صولت بیگ ہے

گا۔ اور میں نہیں چاہتا۔ یہ سفاک لوگ اسے بھی قتل کر ڈالیں۔"

"آخر قاتل صولت بیگ سے کیا چاہتے ہیں؟" اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ تم جلدی جلدی اپنا کام مکمل

کرو۔ میں ذرا انیسٹر کا مران مرزا سے بات کر لوں۔ اب پانی سر سے گزرنے لگا ہے۔ ہم لوگوں کو اہ

دقت سے حرکت میں آنا پڑے گا۔ جس سے مجرم کا دھڑک رہے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ تیزی سے، ورنہ وہ

آگے نکل جائیں گے اور ہم پیچھے رہ جائیں گے۔"

ان : بالکل یہی بات ہے۔

اچھی بات ہے۔ پہلے تو تفصیلات ہو جائیں ذرا۔

انپکٹر جمشید نے پوری تفصیلات سنا دیں۔ انپکٹر کامران

مرزا سننے رہے، آخر ان کے خاموش ہونے پر بولے :

”تب پھر ہم فوراً آ رہے ہیں۔ بھئی جمشید۔ کیا شوکی برادہ

رہی بلا لیں؟

”ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ آپ انھیں فون کر دیں۔

”بھی اپنے شہر سے دارالحکومت کے لیے روانہ ہو جائیں۔

”ٹھیک ہے۔“

اور انھوں نے رسیور رکھ دیا :

”نو بھئی اکرام۔ یہ لوگ تو اب ڈیڑھ دو گھنٹے تک آجائیں

گے۔ اب ہم صولت بیگ کے سلسلے میں کچھ کر لیں ذرا۔

”نکل بیک کیا اندازہ لگایا؟“

”سر۔ پانچ آدمیوں کے قدموں کے نشانات ملے ہیں اور

ان قدموں کے نشانات کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔

اکرام نے مسکرا کر کہا۔

”واہ۔ اکرام تمہارا جواب نہیں۔ چلتے پھرتے انسپیکٹوریڈیا

ہو۔ تو پھر چلو۔ ان پانچ سے دو دو باتیں ہو جائیں۔“

”تشریف لائیے۔ یہاں کا معاملہ عملہ سنبھال لے گا۔“

یہ کہ کر وہ فون کی طرف پکے۔ جلدی جلدی انپکٹر کامران  
مرزا کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ سلسلہ ملتے ہی دوسری طرف  
سے آفتاب کی آواز سنائی دی :

”السلام علیکم۔ خادم کو آفتاب احمد کہتے ہیں۔ فرمائیے۔“

”میں جمشید بات کر رہا ہوں۔ کامران مرزا کہاں ہیں؟“

”گھر میں ہی ہیں۔ میں انھیں بلاتا ہوں۔ آجا جان۔“

آئیے۔ انکل جمشید کا فون ہے۔“

”اوہ ! تب تو کوئی اہم بات ہو گی۔“ انپکٹر کامران

کی آواز سنائی دی اور پھر وہ فون پر آ کر بولے :

”ہاں بھئی السلام علیکم۔ کیا معاملہ ہے؟“

”وعلیکم السلام۔ جیرال۔“ وہ بولے۔

”جیرال۔ کیا مطلب۔ یہ جیرال کا ذکر کہاں سے

آیا۔ اس کی تو ہڈیاں تک گل بٹ گئی ہوں گی۔“

”لیکن وہ زندہ سلامت حالت میں ایک بار پھر ہمارے

پر ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”آپ کے ذمے یہی کام ہے۔“

”یعنی یہ معلوم کرنا کہ وہ ایک بار پھر زندہ سلامت ہمارے

سامنے کس طرح موجود ہے۔“

وہ باہر نکل کر جیب میں بیٹھے اور اکرام نے جیب پر

بر چھوڑ دی۔ جلد ہی جیب شہر سے باہر نکل چکی تھی۔ اندر دیکھتے ہیں؟

وہ سڑک سے اتر کر ایک کچی سڑک پر چلنے لگی۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ چیزیں بے ترتیب پڑی تھیں،

”ہم ان کے خفیہ ٹھکانے کے نزدیک ہیں سر۔ اور وہاں چیز بھی جگہ پر نہیں تھی۔ کھانے کے برتن ادھر

خطرناک ہیں۔“ سر بکھرے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انھیں مدت

لیکن بھی۔ جب تم ان کے خفیہ ٹھکانے سے ملے۔ دھویا ڈگیا ہو۔

”ہو تو انھیں آج تک گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟“ سوال یہ ہے سر کہ اب ہم ان کا سراغ کس طرح

”یہ گرفتار ہو چکے، مقدمہ چل چکا۔ سزا کاٹ کر آئیں؟“ اکرام نے کہا۔

اور جس خفیہ ٹھکانے سے انھیں گرفتار کیا گیا تھا، اب ”فراہر کر دے۔“ میں یہاں کی چیزوں کا جائزہ لے لوں۔

وہیں رہتے ہیں، لیکن جیل سے رہا ہونے کے بعد۔

”یک ان کا کون بزم پولیس کی نظروں میں نہیں آیا۔“ اب انھوں نے ایک ایک چیز کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک

ان کی پہلی واردات ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“

پانچ منٹ بعد وہ جنگل میں گھری ایک پرانی عمارت غالباً یہ لوگ کارزار ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ ان بلوں

سامنے پہنچے۔ عمارت کا دروازہ بند تھا۔ انپکٹر جمشید نے طرف ان کا دھیان نہیں کیا، درندہ وہ یہاں کبھی نہ رہنے

کو ایک ٹھوکر دیکھی۔ دروازہ کھل گیا۔

”شاید اندر کوئی نہیں ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”اس کا مطلب ہے۔“ یہ لوگ واردات کرنے کے

اس طرف نہیں آئے۔“

کسی سے کچھ نہ پوچھنا اکرام۔ ہم اس وقت سادہ

ہا میں ہیں۔ کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ ہو سکتا ہے،

طرح وہ پانچوں ہمیں یہاں خود بخود نظر آ جائیں۔“



انیکٹر جمشید نے ایک میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”او کے سر“ اس نے فوراً کہا۔

دونوں ایک دور کی میز پر جا بیٹھے۔ میرا اس بات

نے پینے کی کچھ چیزوں کا آرڈر دے دیا۔

”کیا خیال ہے اکرام۔ تمام لوگوں کا جائزہ لے کر

وہ نظر آئے یا نہیں؟“

”ابھی تک نظر نہیں آئے سر۔“

”اس بات کا بھی خیال رہے کہ کہیں وہ ایک آپ نے جیب میں ان کا تعاقب کیا۔ یہ تعاقب بیس منٹ

نہ ہوں۔“

”اوہ ہاں سر۔ اب میں اس خیال کے تحت دیکھتا ہوں۔“

”اگر مجھے ان کے چلے معلوم ہوتے تو میں یہ اندازہ فوراً تو بھئی۔ شاید ان کے باقی تین ساتھی یہاں ہیں۔

اب آئے گا مرزا۔ شاید صولت بیگ کا ان سے پتا

مل جائے۔“

”لیکن سر۔ پہلے اس عمارت کو گھیرے میں لیا جانا ضروری

اکرام نے کاغذ پر پنسل سے بیس منٹ میں پانچ چہرے اکرام نے کہا۔

بنا دیے۔ انیکٹر جمشید ان چہروں کو بغور دیکھتے رہے۔ ”ہاں! ٹھیک ہے۔ تم جلد از جلد اپنے ماتحتوں کو یہاں

پھر انھوں نے ہوٹل میں موجود گاہکوں کو بغور دیکھا۔

دہلی آواز میں بولے :

”ان میں سے کم از کم دو یہاں موجود ہیں۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“

”انتظار۔ شاید ان کے باقی ساتھی بھی یہاں آجائیں۔“

”او کے سر“ اکرام بولا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں کھانا کھانے کے بعد اٹھے اور

بل ادا کرتے کے بعد بیرونی دروازے کی طرف چلے۔

دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر ان کی ایک پُرانی سی کار کھڑی تھی۔ دونوں

اس میں بیٹھ کر دہاں سے روانہ ہوئے۔ اب انھوں

جیب میں ان کا تعاقب کیا۔ یہ تعاقب بیس منٹ

تک جاری رہا اور پھر ایک عمارت میں وہ کار داخل ہو

گئی۔

”شاید ان کے باقی تین ساتھی یہاں ہیں۔“

اب آئے گا مرزا۔ شاید صولت بیگ کا ان سے پتا

مل جائے۔“

”لیکن سر۔ پہلے اس عمارت کو گھیرے میں لیا جانا ضروری

اکرام نے کاغذ پر پنسل سے بیس منٹ میں پانچ چہرے اکرام نے کہا۔

بنا دیے۔ انیکٹر جمشید ان چہروں کو بغور دیکھتے رہے۔ ”ہاں! ٹھیک ہے۔ تم جلد از جلد اپنے ماتحتوں کو یہاں

پھر انھوں نے ہوٹل میں موجود گاہکوں کو بغور دیکھا۔

دہلی آواز میں بولے :

”ان میں سے کم از کم دو یہاں موجود ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد اس عمارت کو پوری طرح گھیرے میں

”ارے ارے! یہ کیا کر رہے ہیں؟ وہ گھبرا گیا۔  
 ہم جانتے ہیں، لاتوں کے جھوٹ باتوں سے نہیں مانتے۔“  
 اکرام نے مزہ بنایا اور ایک بار پھر گھنٹی بجادی۔

”میں جا رہا ہوں۔“ اس نے بولکھلا کر کہا اور جانے کے  
 لیے مڑا۔

لیکن اسی وقت وہ بہت زور سے اچھلا اور گھر سے باہر  
 آکر گرا۔

”اب اکرام نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ کچھ  
 دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کی شکل نظر آئی۔  
 ”جی فرمائیے؟“ اس نے کہا۔

”ہمیں، ارخان سے ملنا ہے۔“

”یہاں تو کوئی بد خان نہیں رہتا۔“

”اچھا تو باجا خان کو اطلاع کر دیں۔“

”اس نام کا بھی کوئی آدمی نہیں رہتا۔“

”لیکن ہم نے ان ناموں نے دونوں آدمیوں کو اندر داخل  
 ہوتے دیکھا ہے۔“

”جی کیا فرمایا؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”بھئی جاؤ۔ اندر انھیں کہو، سب انپکٹر اکرام آیا ہے۔“

”کیا کہا؟“ اس نے گھبرا کر کہا اور کچھ ادھر کے بغیر اندر

گیا۔ ساتھ ہی دروازہ کھٹ سے بند ہونے لگا، لیکن

انپکٹر جمشید نے فوراً دروازے میں پیر اڑا دیا۔

”یہ کیا۔ آپ دروازہ بند کیوں نہیں کرنے دے رہے؟“

”تاکہ ہمیں کھولنے میں دقت نہ ہو۔“

”لیکن میں دروازہ بند کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”تو نہ جاؤ۔“ اکرام پھر گھنٹی بجادی۔

اکرام نے پھر گھنٹی بجادی۔

"نہیں۔۔۔ اپنے شہر سے۔ ابھی ابھی انپکٹر جمشید کا فون آیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ جیرال پھر آ گیا ہے۔"  
 "جج۔۔۔ جیرال پھر آ گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"  
 "یہ مجھے معلوم کرنا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم انپکٹر جمشید کی مدد کرو گے۔"  
 "ہم اور ان کی مدد کریں گے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ شوکی نے کہا۔"

"یار ادھر ادھر کی نہ لائیں۔ اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔ ہم بھی روانہ ہو رہے ہیں۔"  
 "تو اب ملاقات دہاں ہو گی۔"

"یہ ضروری نہیں۔ ہم سیدھے دہاں جائیں گے اور جاتے ہی اپنا کام شروع کر دیں گے۔ بلکہ ہم تو اپنا کام یہیں سے شروع کر کے چلیں گے۔"

"آپ کی آپ جانیں۔ کیا ہمیں دہاں انکل جمشید پارٹی سے ملنا ہے؟"

"ملاقات ہو جائے تو ٹھیک۔ نہ ہو سکے تو تم بھی دہاں جا کر اپنا کام شروع کر دینا۔"  
 "لیکن کیا؟"

"پتا نہیں۔ لیکن تمہیں اپنا کام شروع کرنا ہو گا۔"

## آسیب کی آواز

شوکی برادرز کے فون کی گھنٹی بجی :

"آ گیا کیس۔ آفتاب چلا اٹھا۔"

"بلی کو چھیڑوں کے خواب۔" رفعت مسکرائی۔

"معاف کرنا۔ بلی ہو گی تم۔ ہاں تم ہمیں بتے ضرور کہہ سکتی ہو۔ آفتاب نے جل کر کہا۔"

"ایک منٹ! پہلے میں فون سُن لوں۔ شوکی نے چلا کر کہا اور ریسور اٹھایا :

"اسلام علیکم! شوکی بات کر رہا ہوں۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بس دارالحکومت پہنچ جاؤ۔ دوسری طرف سے انپکٹر کام"

مرزا کی آواز سنائی دی۔

"ارے! یہ تو انکل کامران مرزا ہیں۔ شوکی چمکا۔"

"ہاں! ہوں تو میں ہی۔ وہ بولے۔"

"تو کیا آپ دارالحکومت سے بات کر رہے ہیں؟"



”ہمارے بنک میں اس وقت صرف نو سو روپے ہیں اور نو سو روپے میں پانچ لاکھ تو کیا، ایک بھی نہیں آئے گا۔ آفتاب نے منہ بنایا۔

”اوہ ہاں! یہ بات بھی ہے۔ خیر۔ اپنے کرنل صاحب، انکل راجندر۔ انکل کاشان کب کام آئیں گے۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں یہ کام کر کے آتا ہوں۔“

”چلیے ٹھیک ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دارالحکومت جا رہے تھے۔ ایئرپورٹ سے انکل کر انھوں نے ایک ٹیکسی لی اور انیسٹر جمشید کے گھر پہنچے۔ ابھی دتک نہیں دی تھی کہ شوکی چونک اٹھا:

”ہائیں! آفتاب ریک جاؤ۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میرا نام ہائیں آفتاب نہیں ہے۔ آفتاب احمد ہے۔“

”ہاں یا۔ ابھی دتک نہ دو۔“

”اچھی بات ہے۔ لیکن ابھی دتک نہ دینے کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے۔“

”ہاں! کیوں نہیں۔ ذرا اس طرف دیکھنا۔“

”ک۔ کس طرف؟ وہ ایک ساتھ بولے۔

”بھئی انکل کے گھر کے بالکل سامنے۔ سڑک کے اُس پار۔“

”اچھی بات ہے۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ اور دیکھ لیں گے حیرال کو۔ ارے مگر۔ انکل وہ تو آپ لوگوں کے ہاتھوں ہلاک میرا مطلب ہے سو فی صد مارا گیا تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے زندہ ہو گیا؟“

”میں نے کہا نا۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں۔ تمہیں کس طرح بتا سکتا ہوں۔“ انیسٹر کامران مرزا نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔

”تب پھر، ہم بھی کیوں نہ یہی بات معلوم کرنے کے چکر میں پڑ جائیں؟“

”اس طرح دو پارٹیاں ایک کام کریں گی اور وقت ضائع ہو گا۔“

”تب پھر۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کیا شروع کریں۔“ یہ دواں جا کر خود معلوم کر لینا۔ یاد تم سمجھتے کیوں نہیں؟“

”اچھا یہ تو۔ سمجھاؤ ہوں نہیں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے ریسور رکھ دیا۔

”واہ! سمجھانے کا کتنا خوب صورت طریقہ ہے۔ آؤ بھی دارالحکومت چلیں۔ شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

”لیکن جائیں گے کیسے؟“

”ہوائی جہاز سے۔ میں ابھی جانے کا انتظام کرتا ہوں۔“

وہ سفید رنگ کا چھوٹا سا مکان ہے نا۔ اس کی دوری منزل کی کھڑکی کھلی ہے۔

”عد ہو گئی۔ آخر اس سے کیا ہوتا ہے بھائی جان کیا کسی مکان کی کھڑکی کھلی ہونا بھی کوئی عجیب بات ہے۔“

”یہ عجیب بات اس وقت ہو جاتی ہے۔ جب اس میں کوئی دور بین فٹ ہو اور اس دور بین سے مسلسل نگاہ کے گھر کی نگرانی کی جا رہی ہو۔“

”اوہ! ارے بھائی! آفتاب دھک سے رہ گیا۔“

”لہذا اب ہم اندر بعد میں جائیں گے۔ پہلے اس مکان تک ہو آئیں۔“ انکل کامران مرزا نے ہمیں کام شروع کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ کیا شروع کرنا ہے۔ لہذا ہم اپنا کام سفید رنگ کے اس مکان سے شروع کریں گے۔

بالکل ٹھیک۔ رفعت پرجوش انداز میں بولی۔ اور پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے سڑک عبور کر گئے۔ دروازہ انھیں کھلا نظر آیا۔ اندر ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی کار کھڑی تھی۔ آفتاب نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ہاتھ رکھے ہی رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہونق سا نوجوان سامنے آکھڑا ہوا:

”م۔ م۔ میں۔ میں آپکا ہوں۔ اب گھنٹی پر ہاتھ رکھنے کا کوئی فائدہ مزید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس مکان میں میرے علاوہ اور کوئی انسان نہیں ہے۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”بات معقول ہے، لہذا میں ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔“

”شش۔ شکریہ! اس نے سکون کا سانس لیا۔

”آپ کا نام؟“ شوکی نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ ”م۔ م۔ میں۔ یعنی کہ میں۔۔۔“

”جب آپ کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں رہتا۔ تو پھر یہ سوال آپ سے نہیں تو اور کس سے کیا ہو گا ہم نے؟“ آفتاب بھٹا اٹھا۔

”م۔ م۔ میں سمجھ گیا۔ آپ نے یہ سوال مجھ سے ہی پوچھا ہے۔“ وہ بولا۔

”اوپر والی منزل خالی ہے کیا؟ اچانک اخلاق بول اٹھا۔ ”نہیں! میں اوپر والی منزل پر ہی رہتا ہوں۔ اس لیے کہ نیچے آسیب رہتے ہیں۔“

”کی مطلب؟“ وہ پتہ تک اٹھے۔

”م۔ مالک مکان نے بتایا تھا کہ میں صرف اوپر رہ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ پچلی منزل اس نے چند آسیبوں کو

کراتے پر دے رکھی ہے۔

بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

”ارے باپ رے۔۔۔ پپ۔۔۔ پولیس! اس کا رنگ اڑ گیا۔

اس وقت انھوں نے دیکھا۔ وہ کافی خوب صورت

انسان تھا۔ صاف رنگ، سیاہ بال۔ بھوری آنکھیں۔ چہرہ

بالکل گول نہ زیادہ لمبا۔ ستواں ناک۔ اس کی آنکھوں پر

دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت شرمیلے ہو۔

جب کہ چہرے سے معصوم سا لگتا تھا اور بے وقوف سا

بھی۔

”بس ہوا ہو گئی ساری اکڑ فوں۔“ شوکی ہنسا۔

”یہ۔۔۔ یہ مجھ پر الزام ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”وہ کیسے؟“

”میں نے اکڑ فوں کب دکھائی۔ کہ وہ ہوا ہو گئی۔“

”خیر نہیں دکھائی ہو گئی۔ اب میرا بی فرما کر اپنا نام بتائیں،

”کیونکہ ہم کھڑے کھڑے تھک گئے ہیں۔“

”تو اندر۔ نہیں۔ اوپر چل کر بیٹھیے نا۔“

”ہاں! میرا خیال ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“ شوکی نے کہا۔

”ضرور آئیے۔ مجھے خوشی ہو گی۔“

”جب کہ میرا خیال ہے۔ خوشی نہیں ہو گی۔“ شوکی مسکرا

”دیکھا جائے گا۔ نہیں ہو گی تو نہ سہی۔“ اس نے

”حد ہو گئی۔ اب آئیے بھی کراتے پر مکان لے کر

دہنے لگے۔“ آفتاب بھٹا اٹھا۔

”جی ہاں! ہے نا عجیب بات، لیکن میرے مالک

نے بتایا تھا کہ اب آپسوں کو خالی مکان نہیں ملتے

جہاں جاتے ہیں۔ سائنسی آلات کی مدد سے انھیں

باہر کیا جاتا ہے۔ لہذا اب انھوں نے بھی مکان کراتے

پر لینا شروع کر دیے ہیں۔“

”اچھا بھائی۔ مان گئے۔ لینے لگ گئے ہوں گے

آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”آپ نے بتانے کی مہلت ہی کب دی ہے۔“

”چلیے۔ اب آپ کو مہلت ہی مہلت ہے۔ بتائیں؟“

”لگ۔ کیا بتاؤں؟“

”حد ہو گئی۔“ آفتاب جھلا اٹھا۔

”یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

”کیا کیسے بتا سکتے ہیں؟“

”حد ہو گئی۔“ اس نے فوراً کہا۔

”اچھا بابا۔ مان گئے آپ کو۔ آپ ہمارے بھی گرد

ہیں۔ اب سیدھی طرح نام بتائیں، ورنہ پولیس کو بلانا ہمارے



پہلی بار غصے میں آتے ہوئے کہا۔

”اوہو۔ تو آپ کو بھی غصہ آتا ہے۔“

”بہت کم۔ کبھی کبھار۔“ وہ فودا ہی مسکرا دیا۔

”یار آپ آدمی ہیں یا گھن چکر۔ ابھی ابھی غصے میں آئے تھے۔ اور ابھی ابھی ہنس دیے ہیں۔“

”شاید اسی کا نام زندگی ہے۔“ اس نے عجیب سے

کہا، پھر مڑا اور انھیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

داخل ہوتے ہی بائیں طرف انھیں زینہ نظر آیا۔ جو نہی

کے نزدیک پہنچے۔ ایک ہولناک آواز نے ان کے ہوش

”ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ کیسی آواز تھی؟“

”آسیب کی۔“

”آسیب کی آواز۔“ آفتاب نے حیران ہو کر کہا اور ساتھ

وہ اٹا کھڑا ہو گیا۔

## بیان

”سنو بھی۔ سوال یہ ہے کہ حیرال کیسے زندہ ہو گیا، جبکہ

ہم لوگوں کے ہاتھوں مکمل طور پر مارا گیا تھا اور ہم نے

کوئی شک نہیں رہنے دیا تھا۔ یعنی اس کی موت کا سو

کی صد یقین کر لیا گیا تھا۔ اور اس بات کا قطعاً کوئی

مکان نہیں رہ گیا تھا کہ اب زندگی میں کبھی حیرال سے

ملاقات ہو گا۔ لیکن تمہارے اٹکل جمشید کا سامنا ایک بار

پھر حیرال سے ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ انپکٹر کامران

بڑا کہتے چلے گئے۔

”بھلا ہم کیا بتا سکتے ہیں۔“ آفتاب نے منہ بنایا۔

”عقل سے کام لے کر۔“

”عقل ہو گی تو عقل سے کام لیں گے نا۔“ فرحت مسکرائی۔

”چلو تمہارے پاس تو ہے۔ تم بتا دو۔“

”یہ انشارجہ کی شرارت لگتی ہے۔ لہذا ہمیں اخبارات

دیکھنا ہوں گے: فرحت نے فوراً کہا۔

"کہاں کے اخبارات۔ انشادجہ کے یا یہاں کے؟"  
"دونوں جگہ کے۔"

"تو پھر آؤ۔ یہ کام ہم اپنی لائبریری سے شروع کرتے ہیں۔"

اور وہ لائبریری میں آگئے۔ انھوں نے تین دنوں

کے اخبارات دیکھنا شروع کیے۔ نہ جانے اس کام میں ان

کتنا وقت لگ گیا۔ آخر آصف کی نظر ایک چھوٹی سی

پر پڑی۔ وہ چونک اٹھا:

"انکل۔ ذرا آپ اس خبر کو دیکھیے۔ لگتا تو نہیں کہ یہ

سئلے کا تعلق اس خبر سے ہو، لیکن پھر بھی آپ اس کو نہیں

پڑھ ضرور لیں۔"

"ابھی بات ہے۔ لاؤ۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اخبار

سے نظریں ہٹائیں اور اس خبر پر جمادیں۔ اس وقت تک

آفتاب اور فرحت بھی اس خبر کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

انھوں نے دیکھا۔ خبر ان کے اپنے ملک کے اخبار کی تھی اور

ان کے ملک کی رسدگاہ کے انچارج کا ایک جھوٹا سا بیان

تھا۔ بیان یہ تھا:

"گزشتہ رات میں نے آسمان سے ایک ستارہ سا

گرتے دیکھا۔ وہ آگ کی مانند روشن تھا، لیکن

بوں بوں وہ نیچے آتا گیا، گول تھال سا بنتا چلا گیا۔

اور میں یہ بات یقین سے کر سکتا ہوں کہ وہ کوئی

اڈن طشتری تھی۔ ساتھ ہی میرا دعویٰ ہے کہ وہ

انشادجہ کی سرزمین پر کہیں گری ہو گی۔"

یہ کون سی تاریخ کا اخبار ہے؟

"نو نومبر کا۔" آصف نے کہا۔

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ٹھیک ہے۔ نو نومبر کے بعد کے انشادجہ کے تمام

اخبارات چھان مارو۔ وہاں اڈن طشتری گرنے کی خبر ہے

ثاقب تھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ انتاج کے اخبارات نے شہاب ثاقب کے گرنے کی بھی خبر نہیں شائع کی تھی۔ لہذا مجھے دوسرا خیال قائم کرنا پڑا۔ وہ بولے۔

”اور وہ دوسرا خیال کیا تھا؟“

”یہ کہ انتاج نے اڈن طشتری کے گرنے کی خبر کو چھپایا، اخبارات میں نہیں آنے دیا۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ چونک کر بولے :

”لیکن پروفیسر صاحب — یہ لوگ تو عام طور پر اڈن طشتریوں کی خبریں اڑاتے دہتے ہیں۔“

”ہاں! لیکن نہ جانے کیوں — اس خبر کو چھپایا گیا۔ انھوں نے کسی قدر گھبرا کر کہا۔“

”اس کا مطلب ہے — اس بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہمیں انتاج کا سفر کرنا پڑے گا — ورنہ ہم یہ راز نہیں جان سکیں گے۔“

”یہ آپ جانیں — ویسے ایک بات اور ہے۔“ وہ کوئی خیال آنے پر چونکے۔

”اور وہ کیا؟“

”میں نے اس اڈن طشتری کے گرنے کی فلم بنالی تھی، اگر آپ دیکھنا چاہیں تو آپ کو دکھا سکتا ہوں۔“ انھوں نے

”لیکن شہاب ثاقب گرنے کی خبر بھی ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔ ہمیں رسد گاہ جانا ہوگا۔“

وہ اسی وقت دارالحکومت کے لیے رواد ہو گئے۔ ایرپورٹ سے اتر کر سیدھے رسد گاہ پہنچے۔ انتاج کا پروفیسر ارسلان تھا۔ انھوں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ لوگوں کی یہاں آمد میرے لیے حیرت کا باعث اور خوشی کا بھی — فرمائیے — میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”نو نوہر کے اخبارات میں آپ کا ایک بیان شائع ہوا۔ آپ نے اڈن طشتری کو گرتے دیکھا ہے اور آپ کا دعویٰ ہے کہ وہ انتاج کی سرزمین پر گر گئی تھی۔“

”جی ہاں بالکل! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

”اس کے بعد آپ نے اس معاملے کی طرف کوئی دی تھی؟“

”میں نے اگلے روز کے اور اس کے بعد کئی روز کے اخبارات کے اخبارات چیک کیے تھے — لیکن ان میں اس کی کوئی خبر نظر نہیں آئی تھی۔“

”پھر اس سے آپ نے کیا اندازہ لگایا تھا؟“

”ایک اندازہ تو یہ تھا کہ وہ اڈن طشتری نہیں، کوئی شہاب



جلدی جلدی کہا۔

”بہت خجب! یہ ہوتی نا بات۔“

انھوں نے فلم کو غور سے دیکھا، بلکہ کئی بار دیکھا

پھر وہ وہاں سے نکل آئے:

”دال میں کچھ کالا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے۔ پروفیسر ارسلان کچھ چھپا رہے ہیں۔ نہیں ہوتے۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”ہم نے بھی اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا تھا، تب ہمارا خیال ہے کہ آپ اٹن طشتری کے بارے میں کچھ

پھر اب کیا ارادہ ہے؟“

”پروفیسر کا فون ٹیپ کرا دیتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”م۔ میں۔ ن۔ نہیں۔ تو۔“ وہ گڑ بڑا گئے۔ چہرے

اور پھر انھوں نے اپنی گاڑی میں سے ایکس پیج کو فون کی کالنگ اڑ گیا۔

تعارف کرانے کے بعد انھوں نے بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ یہ معاملہ کوئی عام معاملہ

انھوں نے اپنا نمبر بھی انھیں نوٹ کرا دیا۔ اور کار میں ادھر کہیں ہے۔ ہمارا پورا ملک اس کی پیٹ میں آ سکتا

ادھر گھومنے لگے، لیکن ایک گھنٹا گزرنے پر بھی کوئی رپورٹ ہے۔ لہذا اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو فوراً بتا دیں،

ذمہ تو وہ پریشان ہو گئے۔

”میرا خیال ہے۔ کچھ گڑ بڑ ہے۔ ہمیں فوری طور پر پروفیسر سے دیکھیے۔ ہم جانتے ہیں۔ آپ وطن سے اور اس قوم سے

محبت کرتے ہیں، لیکن ہو سکتا ہے، اس وقت آپ پر کوئی

فرحت بولی۔

دباؤ ہو اور آپ اس دباؤ کی وجہ سے کچھ بتانے کے قابل

نہ ہوں۔ کیا یہی بات ہے؟

پروفیسر ارسلان نے فوراً ان کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں کہا:

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"اچھا، ہم چلتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

وہ ان سے ہاتھ ملا کر باہر آ گئے۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا! آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔"  
انپیکٹر کامران مرزا نے ان کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں کہا:

"خاموش رہو۔ اور صرف خود کردہ۔"

اب وہ کار میں بیٹھ گئے اور دلوں سے روانہ ہو گئے۔  
کار میں وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے پروفیسر ارسلان کی کوئی بات نہ کی۔ یہاں تک کہ۔۔۔ باتوں باتوں میں انپیکٹر کامران مرزا نے کہا:

"بھئی! اس بھاگ دوڑ نے بھوک لگا دی ہے۔ کہیں سے کچھ کھا لینا چاہیے؟"

"تو پھر انکل کے گھر کیوں نہ چلیں۔ آنتی چند منٹ میں کھانے تیار کر دیتی ہیں۔"

"اس میں شک نہیں۔ لیکن آج میں کسی ہوٹل میں کھانا

چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چلیے۔ وہ ایک ساتھ بولے۔"

اور پھر وہ ایک ہوٹل میں آ بیٹھے:

"بات دراصل یہ ہے کہ پروفیسر ارسلان جو بات بھی کریں گے۔ وہ سُن لی جائے گی۔ اور اس وقت وہ شاید دشمن کی زد پر ہیں۔ ادھر جب ہم ان کی مدد گاہ میں گئے تھے تو اس وقت ضرور ہماری گاڑی میں بھی آف فٹ کر دیا گیا تھا۔ تاکہ دشمن جان سکے کہ ہم پروفیسر ارسلان کے بارے میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔ اسی لیے میں تم لوگوں کو یہاں لے آیا ہوں۔"

"اگر پروفیسر ارسلان کسی خطے میں ہیں۔ تب تو ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔"

"ہاں! ہم ایسا کریں گے، لیکن سلیقے سے۔ یہاں سے ہم سیدھے اکیس چینج جائیں گے اور پروفیسر ارسلان کے فون پر ہونے والی بات چیت سنیں گے۔ جلد یا بدیر آخر دشمن ان سے بات کرے گا۔ اور صرف اس وقت ہمیں اندازہ ہو سکے گا کہ پروفیسر صاحب کس حالت میں ہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی کہا۔"

"بالکل ٹھیک۔ وہ بولے۔"

اور پھر وہ ایکس پیمنج پہنچ گئے۔ فوراً ان کے لیے یہ سہولت مہیا کر دی گئی کہ وہ پروفیسر ارسلان کے فون پر ہونے والی بات چیت سن سکیں۔ ابھی تک کوئی بات چیت نہیں کی گئی تھی۔ وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے :

”میرا خیال ہے۔ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔“  
”کون سا کام؟“ انیکٹر کامران مرزا چونکے۔

”جی۔ یہی۔ انتظار کرنا۔“

”ہاں! یہ بات تو ہے۔“

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ جلد ہی انھوں نے پروفیسر ارسلان کی آواز سنی :

”ہیلو۔ پروفیسر ارسلان بات کر رہا ہوں۔“

”اور یہ ہم ہیں آپ کے مہربان۔ آپ نے انیکٹر کامران مرزا کو اصل بات نہیں بتائی۔ اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔“

”اے۔۔۔ لیکن میرے بیٹے کو تو چھوڑ دو اب۔“ پروفیسر بولے۔

”چھوڑ دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس آپ اپنی زبان بند رکھیں گے، کیونکہ آپ کے گھر میں جو بات بھی ہو گی، وہ ہم سن لیں گے اور اگر آپ نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو ہم پھر آپ کے بیٹے کو اغوا کر لیں گے۔ ایک گھنٹے تک آپ کا بیٹا آپ کے پاس موجود ہو گا۔“

”اوہ! بہت بہت شکریہ۔“

فون بند کر دیا گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا :

”اوہ! تو یہ بات ہے۔“

”ہاں! پروفیسر ارسلان اڈن طشتری کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ یہ بات دشمنوں کو معلوم ہو گئی۔ لہذا انھوں نے ان کے بیٹے کو اغوا کر لیا اور یہ بات وہ کسی سے نہ کر سکے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہو گی۔“  
”سوال تو یہ ہے کہ ہم ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“  
”بہت کچھ۔ تم فکر نہ کرو۔“ وہ مسکرائے۔

اسی وقت وہ پھر پروفیسر ارسلان کے ہاں پہنچے۔ باہر رک کر انھوں نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ انھیں فکر تھا تو یہ کہ کہیں پروفیسر ارسلان انھیں دیکھ کر کچھ بول نہ پڑیں۔ وہ چاہتے تھے، وہ بالکل خاموش رہیں۔ لہذا کاغذ فرحت کو دیا گیا۔ باقی لوگ ایک طرف رک گئے۔ فرحت دبے پاؤں آگے بڑھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی دکھی ہوئی تھی۔ تاکہ جونہی پروفیسر ارسلان کی نظر اس پر پڑے۔ وہ کچھ نہ بولیں۔

دبے پاؤں چلتی وہ ان تک پہنچ گئی۔ اسی وقت



انھوں نے اسے دیکھ لیا۔ ان کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا۔ فرحت نے فوراً کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا، اس پر لکھا تھا :

”آپ بالکل خاموش رہیں گے۔ ہمیں اپنا کام نہایت خاموشی سے کرنا ہو گا۔“

پروفیسر سمجھ گئے۔ انھوں نے چپ سادھ لی۔ اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ سیاہ بٹن نما آلہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس کو بے کار کر دیا، لیکن ابھی ان کا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ تلاش جاری رکھی۔ اس قسم کے تین آلے انھیں مزید ملے اور تب کہیں جا کر انھیں اطمینان ہوا۔

”اب ہم آواز بات چیت کر سکتے ہیں۔ یوں بھی ایک گھنٹا ہونے والا ہے۔ آپ کے بیٹے یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

”لیکن آلات ہٹا دیے جانے کی صورت میں وہ بیٹے کو کیوں بھیجنے لگے۔“ پروفیسر بولے۔

”ابھی دشمن کو اس بات کا پتا نہیں چلے گا۔ جب تک کہ وہ آپ کے بیٹے کو یہاں نہیں بھیج دیتے، کیونکہ آپ اکیلے ہیں۔ جب یہاں کوئی اور ہو گا اور بات چیت

انھیں سنائی نہیں دے گی، اس وقت انھیں پتا چلے گا۔“  
”اوہ! یہ ٹھیک ہے۔“

اور پھر دروازے کی گھنٹی بجی۔ انپکٹر کامران مرزا نے اشارہ کیا کہ وہ دروازے پر جا کر دیکھیں۔ پروفیسر ارسلان نے دروازہ کھول دیا :

”یہ نیچے۔ آپ کا بیٹا۔ اگر ہماری ہدایات پر عمل نہ کیا تو انجام بھیانک ہو گا۔“

”اچھ۔ چھا۔ ان کے منہ سے نکلا۔“

اور انھوں نے دروازہ بند کر لیا، لیکن چند سیکنڈ بعد ہی انپکٹر کامران مرزا باہر نکل گئے۔

ادھر پروفیسر ارسلان اپنے بیٹے کو پیادہ رہتے تھے۔ اس کی عمر دس سال کے قریب تھی :

”یہ۔ یہ کون لوگ ہیں پاپا؟“

”یہ دوست ہیں بیٹے۔ پھر وہ ان کی طرف مڑے :

”لیکن انپکٹر صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟“

”اس کے بتاؤ میں۔ جو آپ کے بیٹے کو لے کر آیا تھا۔“  
”آفتاب مسکرایا۔“

”اوہ!“

”اب آپ جلدی سے ہمیں اصل بات بتا دیں۔“

"تو آپ کیا انیکٹر صاحب کا انتظار نہیں کریں گے؟  
 "نہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو، بتا دیں۔ کچھ نہیں کہا  
 سکتا۔ اگلے لمحے کیا ہو جائے؟"

"اچھی بات ہے۔ تو پھر ٹہنیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ  
 نے واقعی اڈن طشتری کو انشادجہ کی سرزمین پر گرتے دیکھا  
 میں نے اسی وقت وہاں کے سائنس دان ایم برٹن کو مل  
 کیا تھا اور اس بارے میں بات کی تھی۔ اس نے جواب  
 میں کہا کہ وہ چیک کرتا ہے۔ پھر دوسرے دن جب میں  
 نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کہا: "

نہ کی۔ ہر باد میری آواز سن کر ہی ریسور دکھتا رہا۔  
 پھر اسی رات میرے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا۔ دراصل انشاد  
 اس اڈن طشتری کے گرنے کو مکمل طور پر راز میں رکھنا  
 چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے۔ یہ پتہ  
 معلوم نہیں۔"

عین اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی، لیکن انشا  
 کامران مرزا کا نہیں تھا۔

## ہاتھ اٹھا دو

محمود، فاروق اور فرزاد زور لگا کر تھک گئے، لیکن خاڈ  
 گرمانی کے پھرے پر میک آپ ثابت نہ کر سکے۔ آخر محمود  
 نے کہا:

"ہمیں افسوس ہے۔ آپ کو بلاوجہ پریشان کیا۔ ارے  
 وہ۔ وہ۔ وہ کہاں گیا۔ اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے  
 آثار چھا گئے۔"

"بھئی کیا۔ کس کی بات کر رہے ہو؟ فاروق نے منہ بنایا  
 "رومال کی؟ اس نے فوراً کہا۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟  
 "کیا مطلب۔ یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"بھئی رومال کو، ہم نے ایک خالی کمرے میں ڈال دیا تھا  
 فرزاد جھٹا اٹھی۔"

"ادھو۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ وہ اب اس کمرے



میں نہیں ہے۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ خادم گرمائی نے چونک کر کہا۔

”کیوں — کیا ہوا؟“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ کیا تم دیوار کے آد پار دیکھنے کے قابل ہو گئے ہو؟“

”میں آپ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے دہ ہوں یا شائستہ

کی۔ میں اس دروازے کی طرف ہرگز نہیں آیا، پھر بھلا مجھ پر کیسے شک کیا جا سکتا ہے۔“

دومال غائب ہے۔

”یہ ہماری مجبوری ہے۔ اور اصول بھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔ وہم ہو گیا ہے بے چارے کو۔ کمرے کا دروازہ اس وقت سے اب تک جب کسی نے کھولا ہی نہیں تو دومال بھلا کیسے غائب ہو سکتا ہے۔“

”ہم ہر ایک پر ہر حالت میں شک کرنے پر مجبور ہیں،

محمود نے جیسے سنا ہی نہیں۔ آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ ہمارا اصول ہے۔ اور ہم اپنے اصول کو چھوڑتے نہیں،

کھول دیا۔ ان کی نظریں فرش پر جم گئیں۔ فرش پر دومال سیدھی سی بات ہے کہ اندر ان کے سوا کوئی نہیں آیا۔ پہلے

نہیں تھا۔

”ہم تھے۔ آخر دومال کہاں گیا؟“

”ٹھیک ہے۔ آپ میری تلاشی لے لیں۔ اس نے بھٹا کر کہا۔

”شکریہ! یہ ہوئی نا بات۔ ہم آپ کی تلاشی ضرور لیں

میں صرف اور صرف دومال کے لیے فکر مند ہوں۔“

”تو کیا دومال اس کمرے سے اڑ کر مجھ تک آ گیا تھا؟“

”یہ ہمیں نہیں پتا۔ ہم آپ کی تلاشی لیں گے اور بس۔“

”اچھی بات ہے۔ لیجیے تلاشی۔“

”انہوں نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی، لیکن دومال نہ

وہ بند کمرے سے کس طرح غائب ہو گیا؟“

”دومال سے پوچھیں گے۔ فکر نہ کرو۔“ قاروق مسکرایا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ اڑا تو مذاق۔ لیکن بات غور طلب

ہے۔ آخر اندر سے دومال کس طرح غائب ہو گیا۔ سچ

تو یہ ہے کہ مجھے خادم گرمائی صاحب پر شک ہے۔“



کرتے ہیں۔

محمود نے جلدی جلدی کہا اور ایک بار پھر دونوں نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی، لیکن رومال کیس نہ ملا۔

ہم نے خادم گرمائی صاحب کی تلاشی تو لی ہے، لیکن کمرے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آؤ ذرا ایک نظر کمرے کو بھی دیکھ لیں۔ فرزانہ بولی۔

”یہیے جناب! ایک بار پھر تلاشی لے لیں۔ اور یہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس میں صرف ایک دروازہ تھا۔ دو کھڑکیاں بھی تھیں، لیکن ان میں سلاخیں لگی

محمود اور فاروق نے ایک بار پھر یادیک بینی سے تلاشی لی تھیں۔ مطلب یہ کہ کمرے میں صرف دروازے کی طرف ایسے میں خادم گرمائی نے کہا:

”اگر آپ وہ رومال میرے پکڑوں سے نکال کر رکھنا۔

تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔“ ہمیں انعام کا لالچ نہیں۔ اگر رومال آپ کے پاس بخود بڑھایا۔

”ہم بغیر کسی لالچ کے نکال کر دکھائیں گے۔“ ”کوشش کرو۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

”شائستہ۔ تمہارے انکل خادم گرمائی نے ہمیں اکھڑا دیا ہے۔ کیا یہ اکثر یہاں آتے رہے ہیں؟“ ”نہیں۔ کئی مہینے میں ایک چکر لگ جاتا ہو گا۔“

”تو پھر بغور ان کی طرف دیکھتی رہو۔ کیا یہ وہی انکل گرام صاحب ہے، ہم تو ہسپتال جا رہے ہیں اور شائستہ بھی ہمارے میں یا کوئی اور۔ اور ہم وہ رومال تلاش کرنے کی کوشش

”اب تو آپ کا اطمینان ہو گیا۔“

”نہیں ہوا۔ فرزانہ نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”تلاشی پوری نہیں ہو سکی۔ آپ مہربانی فرما کر ایک

تلاشی دیں۔“

”یہیے جناب! ایک بار پھر تلاشی لے لیں۔ اور

کی اجازت بھی دے دیں۔“

محمود اور فاروق نے ایک بار پھر یادیک بینی سے تلاشی لی تھیں۔ مطلب یہ کہ کمرے میں صرف دروازے کی طرف

ایسے میں خادم گرمائی نے کہا:

”اگر آپ وہ رومال میرے پکڑوں سے نکال کر رکھنا۔

تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔“

”ہمیں انعام کا لالچ نہیں۔ اگر رومال آپ کے پاس بخود بڑھایا۔

”ہم بغیر کسی لالچ کے نکال کر دکھائیں گے۔“

”کوشش کرو۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

”شائستہ۔ تمہارے انکل خادم گرمائی نے ہمیں اکھڑا دیا ہے۔

کیا یہ اکثر یہاں آتے رہے ہیں؟“

”نہیں۔ کئی مہینے میں ایک چکر لگ جاتا ہو گا۔“

”تو پھر بغور ان کی طرف دیکھتی رہو۔ کیا یہ وہی انکل گرام صاحب ہے،

ہم تو ہسپتال جا رہے ہیں اور شائستہ بھی ہمارے

میں یا کوئی اور۔ اور ہم وہ رومال تلاش کرنے کی کوشش

بھی بتا دو ، وہ کیا ہے ؟

”یہ کہ جیرال نے اس دمال کو ہمارے گھر میں جان بوجھ کر گرا دیا تھا۔ تاکہ اس دمال کو دیکھتے ہی ابا جان یا پردیسیز انکل چونک اٹھیں اور فوری طور پر دمال کو تجربہ گاہ بھیج دیا جائے۔ جیرال جانتا تھا کہ جب پردیسیز صاحب دمال کو لے کر سفر کریں گے اور تجربہ گاہ جائیں گے تو اس کا اثر ان پر ہو جائے گا اور تجربہ گاہ پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہو جائیں گے۔ اس طرح پریشان ہو کر ہم ان کے اسٹپٹوں کو بلائیں گے۔ وہ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جیرال ایسا کیوں چاہتا تھا؟ کیا صرف اس لیے کہ ہم اُنکھ کر رہ جائیں اور جیرال جو پروگرام لے کر آیا ہے۔ ہم اس پروگرام کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔ اب تک یہی ہوا ہے۔ ادھر ابا جان کو کسی اور طرف الجھا دیا گیا ہے۔ گویا ہم جیرال کی ذہنی جنگ کی پیٹ میں پوری طرح آچکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ پریشانی والی بات یہ ہے کہ اس وقت تجربہ گاہ کے اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ باہر والے پھرے دار ضرور موجود ہیں ، لیکن وہ اندر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے۔ صرف باہر دہتے ہیں۔ سوال یہ ہے ، ہم

ساتھ جانا پسند کرے گی۔ لہذا آپ کا کیا پروگرام ہے؟ میں اب اپنے گھر جاؤں گا۔ اپنی کافی بے عزتی چکا۔ اس نے جھٹکا کر لیا۔

”ہم معافی چاہتے ہیں کہ ایسا ہوا ہے ، لیکن اس میں کوئی قصور نہیں۔“

”نہیں ہو گا۔ میری بے عزتی تو ہوئی ہے۔“

یہ کہ وہ نیچے کی طرف چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے انہیں ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔

اب وہ ہسپتال پہنچے۔ پردیسیز صاحب اور ان کے ماسٹرز کے توں بے ہوش تھے۔ ڈاکٹروں کی فوج انہیں ہوش لانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔

وہ باہر آ گئے۔ اب انہوں نے گھر فون کیا :

”اسلام علیکم امی جان۔ انکل تو نہیں پہنچے ابھی تک؟“

”نہیں۔ نہ شوکی برادرز آئے ہیں ابھی تک۔ تمہارے ابا کو کسی جگہ جانا پڑ گیا ہے اچانک۔“

”اوہ اچھا۔ ہم پھر فون کریں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے

ریسیور رکھ دیا۔

”ایک بات قابل غور ہے۔“ ایسے میں خزانہ بولی۔

”شکر ہے۔ کوئی ایک بات تو قابل غور نکلی۔ اب



اب کیا کریں؟

”اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساندش کے ذریعے تجربہ گاہ کو اندر سے خالی کرایا گیا ہے۔ تمام اہم لوگوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اب ان کے لیے میدانِ جان ہے۔“ فاروق بولا۔

”اُف مالک۔ ہمیں فوری طور پر تجربہ گاہ پہنچ جانا چاہیے۔“ محمود نے کانپ کر کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کار میں تجربہ گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ دروازے پر پہنچ کر ہی محمود نے بریک لگا دی اور پھر نگرانوں کی طرف پکے :  
”اس طرف کوئی آیا تو نہیں؟“

”آپ کے والد صاحب آئے تھے۔ اندر ہی ہیں۔“  
”بہت خوب۔ جلدی کریں۔ دروازہ کھول دیں۔“

نگرانوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر جانے لگے۔ فرزانہ نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا :

”آپ کو کیا پتا۔ ہم اصلی ہیں یا نقلی۔ آپ نے ہمیں کیوں نہیں کیا۔ کم از کم آپ ہم سے ہمارے کارڈ تو طلب کر ہی سکتے ہیں۔“

”اوہ ! لیکن یہاں جانے پہچانے لوگوں کے سوا کون

آتا ہے۔ ایک نے کہا۔

”آپ سمجھے نہیں۔ آپ کو کیا پتا۔ اندر ہمارے والد صاحب ہیں یا ان کے میک آپ میں کوئی اور۔ ہم واقعی آپ کے سامنے ہیں یا ہمارے میک آپ میں کوئی اور ہے۔“  
”اوہ ہاں ! ہمیں اس قسم کی ہدایات نہیں ہیں۔“ دوسرے نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے تو آپ اپنے کاغذات، ہمیں دکھائیں نا۔ اور فاروق۔ تم انکل اکرام کو فون کرو۔ ذرا جلدی۔ میں خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔“

”او کے۔“ فاروق نے کہا اور گاڑی کی طرف گھوم گیا۔

”ہمارے کاغذات۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟“  
”اس کی ضرورت ہے۔ ذرا جلدی کریں۔“

”نہیں ! ہم آپ کو اپنے کاغذات نہیں دکھائیں گے، ہم آپ کے ماتحت نہیں ہیں۔“

”اوہو اچھا۔ یہ بات ہے۔“

محمود نے کہا اور جیب سے اپنا پستول بلا کر تیزی سے نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی رائفلوں کو ان کی طرف تانے لگے۔ اس کا پستول ان کی طرف تن گیا۔

”فرزانہ جلدی کرو۔ اندر پہنچ جاؤ۔ اندر کوئی ضرورت نقلی



آدمی ہے۔“

”ارے باپ رے.....“ فرزانہ نے کہا اور اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہاتھ اوپر اٹھا دو دوستو..... ورنہ تم ہمارے نشانے سے تو واقف ہو گے۔“

وہ خاموش رہے..... بس مسکراتے رہے..... جیسے بچوں کی شرارتوں کا بڑے مسکراتے ہیں۔

اسی وقت فاروق فون کر کے لوٹا.....  
”فاروق..... تم فرزانہ کی مدد کے لئے اندر جاؤ۔“

”لیکن تم یہاں اکیلے ہو..... ان چار کے مقابلے میں..... اور ہاتھ بھی نہیں اٹھا رہے..... گویا تمہیں اور تمہارے پستول

یہ کوئی لفٹ نہیں کر رہے..... کیا ان حالات میں، میں اندر جاؤں۔“

”ہاں جاؤ..... جب یہ کوئی حرکت کریں گے، میں دیکھ لوں گا۔“  
”اچھی بات ہے..... جیسے تمہاری مرضی.....“

فاروق نے بھی اندر کی طرف دوڑ لگا دی.....  
”بس ٹھیک ہے..... اب دروازہ باہر سے بند کر دو۔“ ایک بھاری بھر کم

آواز سنائی دی۔  
محمود نے چونک کر دیکھا..... اس سے کچھ فاصلے پر ایک

دھت کی ادٹ میں کوئی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں کلاش کوف تھی۔

میں سرٹ ان چار میں سے ایک نے کہا۔  
محمود چکرا کر رہ گیا۔ وہ اگر ان چار پر قابض کرتا تو

کلاش کوف وٹلا اس پر قابض کرتا۔ جب کہ وہ خود مکمل طور پر

دھت کی ادٹ میں تھا۔ اور اس کی آواز سننے سے پہلے اس کی موجودگی کا انہیں احساس تک نہیں ہوا تھا۔

لہذا وہ ساکت رہ گیا۔ ادھر دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا:  
”اب تم اپنا یہ ننھا سا پستول نیچے گرا دو دوست، کیونکہ

جیرال کی عقل کو نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ہر بات کی پہلے سے

محمود نے کچھ کہے بغیر پستول گرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی

کے سر پر کوئی دھنی چیز لگی۔ اس کا سر بہت زور سے

پکرایا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال کونسا تھا کہ نہ جانے اندر فاروق اور فرزانہ

کیا جیتی ہو گئی۔

ہیلو ٹیمپو — کیسے ہو؟ اکرام مسکرایا۔

سر آپ — اور آپ کے ساتھ انیکٹر صاحب؟

ہاں — باقی چار کہاں ہیں؟

اندہر ہی ہیں — آئیے — لیکن آپ نے کیوں زحمت کی،

میں بلوا لیا ہوتا؟ اس نے جلدی جلدی کہا اور آگے بڑھا۔

اندہر ایک کمرے میں اس کے چار ساتھی بیٹھے تاش کھیلنے نظر

آئے اور ایک شخص دیوں سے بندھا ان کے پاس پڑا تھا،

کسی نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا — ساتھ ہی پھینکنے والے

نے کہا: —

کیا یہ صولت بیگ ہے؟

ہمیں ایسے نالائق ملازم کی ضرورت نہیں جس کے ہونے

ہوئے باد بار گھنٹی بجائی جاتی رہے — دفع ہو جاؤ۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی کہنے والا واپس مڑا — گویا

اس بات کی پروا تک نہیں تھی کہ گھنٹی کون بجا رہا ہے۔

اس نے دروازہ بند کیا — انیکٹر جمشید نے آؤ دیکھا

تاؤ — اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی اکرام اندر

ہو گیا — ان کے قدموں کی آواز سن کر ملازم کو باہر پھینک

والا مڑا اور جو نوار انداز میں ان کی طرف دیکھا، لیکن پھر

فدّا ہی اسے سانب سونگھ گیا — چہرے کا رنگ اڑ گیا اور

جسم میں گویا تھر تھری دوڑتی نظر آئی —

## غیر قانونی مار

باہر آ کر گرنے والا شخص خود نہیں آ کر گرا تھا، کسی نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا — ساتھ ہی پھینکنے والے نے کہا:

ہمیں ایسے نالائق ملازم کی ضرورت نہیں جس کے ہونے

ہوئے باد بار گھنٹی بجائی جاتی رہے — دفع ہو جاؤ۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی کہنے والا واپس مڑا — گویا

اس بات کی پروا تک نہیں تھی کہ گھنٹی کون بجا رہا ہے۔

اس نے دروازہ بند کیا — انیکٹر جمشید نے آؤ دیکھا

تاؤ — اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی اکرام اندر

ہو گیا — ان کے قدموں کی آواز سن کر ملازم کو باہر پھینک

والا مڑا اور جو نوار انداز میں ان کی طرف دیکھا، لیکن پھر

فدّا ہی اسے سانب سونگھ گیا — چہرے کا رنگ اڑ گیا اور

جسم میں گویا تھر تھری دوڑتی نظر آئی —



اس کی بیوی کو وہیں ڈھیر کر دیا اور اسے آٹھا لائے  
کیوں یہی بات ہے نا؟

”چلیے اسی طرح ہو گی بات۔ ہمیں کیا فرق بڑا ہے  
نہیں تو اس شخص نے گودنچا دی ہے کہ ہمارا بال بھی بیکار  
نہیں ہو سکتا۔ اور بات ہے بھی یہی۔ لیجیے۔ ہم انہیں  
کرتے ہیں۔ صولت بیگ کی بیوی کو ہم نے ہلاک کیا  
اور اسے ہم نے اغوا کیا ہے۔ آپ ہمارا کیا بگاڑیں گے۔  
پسرو نے جلدی جلدی کیا۔

”اکرام۔ یہ تو بہت بڑا چڑھ کر باتیں بنانے لگے۔  
قون کرو اپنے ماتحتوں کو۔  
”او کے سر۔

”خبردار کریں قون۔ ادھر آپ ہمیں گرفتار کریں گے۔  
ہماری دہائی کے آدمی آپ کو مل جائیں گے۔

”میرے بے وقوف مجھو۔ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ کسی  
تھیں دھوکا دیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس کا نام بتا دو۔  
”افسوس! ہم نہیں بتائیں گے کسی کا نام۔ سہی تو اس کی  
ہے۔ اگر ہم نے اس کا نام نہ بتایا تو وہ ہم پر ایچ نہیں آ  
دے گا۔

”بہت خوب! اب تو ہم نام پوچھ کر دیں گے۔

ادھر اکرام قون کر رہا تھا۔

”اوسے اوسے آپ قون نہیں کر سکتے۔ ان الفاظ کے ساتھ  
ہا وہ پانچوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”اکرام تم قون کرتے رہو۔ میں انہیں روکتا ہوں۔  
”یس سر۔ اس نے پُر سکون انداز میں کہا۔  
”وہ ایک وقت ان پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن ایک منٹ  
بعد وہ پانچوں زمین پر لیٹے نظر آئے۔

”اس بات کو لکھ لیں۔ آپ ہمیں اند نہیں دکھ سکیں گے۔  
”اچھا۔ کیا واقعی؟ ڈیکٹر جمشید سکرانے۔  
”ہاں! یہ ہمارا دعویٰ ہے۔

”ای وقت اکرام ان کی طرف پٹا۔  
”اب اس شریف آدمی کو کھول دو۔ بے چارے کا منہ  
”کری طرح بند کر رکھا ہے ان ظالموں نے۔

”اکرام نے قہراً اسے کھول دیا۔  
”کیا آپ کا نام صولت بیگ ہے؟  
”جی ہاں! آپ کا یہ احسان مجھے زندگی بھر یاد  
رہے گا۔

”یہ احسان نہیں۔ ہماری ڈیوٹی ہے۔ لیکن یہ چکر کیا ہے؟  
”میں اس بلے میں کچھ نہیں جانتا۔



”کیا ان لوگوں نے اغوا کرنے کے بعد آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا؟“

”نہیں۔ ابھی تک انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ آپ سے دفتر چل کر بات ہوگی۔“  
 پھر اکرام کے ماتحت وہاں پہنچ گئے۔ انپکٹر جمشید نے ان کے بارے میں انھیں ہدایات دیں اور پھر صولت بیگم کو لے کر دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔

اپنے دفتر میں اسے کڑی پر بٹھا کر انھوں نے پوچھا:  
 ”ہاں! اب بتائیں۔ کیا معاملہ ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ نہ ان لوگوں نے مجھ سے کچھ کہا۔“

”کیا آپ جانتے ہیں۔ ان لوگوں نے آپ کی بیوی کو ہلاک کر دیا ہے؟“

”ہاں! جانتا ہوں۔ دو رد کر میری آنکھیں اب تو خشک ہو چکی ہیں۔ اس نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔“

”کیا آپ کے پاس کوئی قیمتی دستاویز ہے؟“  
 ”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔“

”آپ اخبارات میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی محبت میں بہت کچھ لکھتے دہتے ہیں۔ ملک دشمنوں لوگوں کے خلاف

کھتے دہتے ہیں۔ کیا یہ کسی ملک دشمن کا کام ہو سکتا ہے؟“  
 ”بات یہی ہے؟ اس نے فوراً کہا۔“

”بہت خوب! آپ کا اب اپنے گھر جانا خطرناک ہوگا۔ ہم آپ کو کسی ریٹ ہاؤس میں ٹھہرا دیں گے۔ آپ کے آرام کا خاص خیال رکھا جائے گا۔“  
 ”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا۔

انھوں نے اپنے عملے کو اس کے بارے میں ہدایات دیں اور پھر اپنے ایک خفیہ اڈے پر پہنچے، وہاں وہ پانچوں بندھے ڈالے تھے۔

”کیوں دوستو۔ کیا حال ہے۔ ابھی تک تمہاری رہائی کے ارڈر تو مجھے نہیں ملے۔“

”یہ سب کیا ہے۔ اگر ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو آپ میں عدالت میں پیش کریں۔ ہمارا چالان کریں۔ ہمیں حوالات

دیجیں۔ یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے ہیں؟“  
 ”تم بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا،

حوالات میں رکھا تو کہیں واقعی کسی وزیر یا صدر کا فون آجائے۔ اور میں پریشانی کا شکار نہ ہو جاؤں۔“

”اس سے کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ میں تم لوگوں کو ریویٹ طور پر قید کر دوں۔“

”لیکن یہ غیر قانونی ہے۔“

”اور کیا تم لوگ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے

ہوئے؟“ انپکٹر جمشید طنزیہ انداز میں بولے، ساتھ میں مسکرائے۔

”وہ لگے ادھر ادھر دیکھنے :“

”ادھر ادھر دیکھ کر کام نہیں چلے گا۔ یہ بتانا ہوگا

”تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اور تم لوگوں کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ صولت

کیوں اغوا کیا گیا۔ اس کی بیوی کو مار ڈالنے کی کوشش

”نہیں بتاتیں گے۔ کچھ بھی نہیں۔“ ایک نے سخت

میں کہا۔

”ان لوگوں کی تھوڑی سی مرمت کی ضرورت ہے۔“

نے اکرام کی طرف دیکھا۔

”اوکے سر۔“ اکرام نے کہا اور پانچ ماتحتوں کو اشارہ کیا،

”طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ایک ساتھ چلائے :“

”یہ سب غیر قانونی ہے۔“

”جو لوگ خود غیر قانونی کام کرتے ہیں، میں ان لوگوں

غیر قانونی مار ہی مارتا ہوں۔“

”اور پھر ان کی مرمت ہو لے گی۔ وہ چیختے چلاتے رہے

”یہاں تک کہ ان کے اچھی طرح کس بل نکل گئے :“

”خدا ٹھہرو بھی۔ اب ان کے مزاج پوچھ لیتے ہیں۔“

مرمت کرنے والے ڈک گئے۔

”اب کیا کہتے ہو؟“

”اس ظلم کا بدلہ آپ سے لیا جائے گا۔“

”پھر دہری بڑھ بڑھ کر باتیں۔ ہوش کے ناخن لو۔ تم

”یہی جگہ ہو۔ جہاں تمہارے سفادشی کا کوئی سراغ دس

”تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اور تم یہیں سک سک کر مر

”جاؤ گے۔ کسی کو کاٹوں کلن پتا نہیں چلے گا۔ تم جیسے

”بحروں سے میں یہی کچھ کرتا ہوں۔“

”لیکن اس کا انجام بہت خوفناک ہوگا۔ ہمارا آدمی آپ

”کو بھی نہیں جینے دے گا، کیونکہ ہم نے اسے ایک بات

”بتا دی ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔“

”اور وہ کیا؟“

”یہ کہ اگر کبھی ہم غائب ہوئے تو انپکٹر جمشید سے ہمارے

”بارے میں پوچھا جائے۔“

”کوئی پروا نہیں۔ اس طرح وہ خود سامنے آجائے گا۔“

”انپکٹر جمشید مسکرائے۔“



”جی نہیں۔ خوش فہمی ہے آپ کی۔ وہ سامنے آئے بغیر آپ سے پوچھنے گا۔ بلکہ اب تک تو وہ پوچھنے کی تیاری کر بھی چکا ہوگا۔ کیونکہ صولت بیگ کے بارے میں ہر آدھ گھنٹے بعد فون کر رہا تھا۔ اور اس بار جب اس نے فون کیا ہوگا تو ہماری طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا۔ لہذا وہ حرکت میں آچکا ہوگا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ حرکت میں آجائے۔ تم پہلے بھی اس کے لیے کام کرتے رہے ہو؟“

”ہاں! بالکل“ وہ بولے۔

”ٹھٹ اٹا رہا ہے۔ اس جرم کا بدلہ تو انھیں ملنا ہے آخر“

”اد کے سر“

”اور پھر ان کی چیخیں آسمان سربرا اٹھانے لگیں۔ ایسے فون کی گھنٹی بجی۔“

”انیکٹر جمشید زور سے چونکے، کیونکہ اس جگہ کے بارے میں ان کے علاوہ صرف ایک آدمی کو معلوم تھا۔“

”اس آدمی کے بارے میں جانتے ہو جس کے لیے کام کر رہے ہو۔ جلدی بتا دو، ورنہ بجلی کے جھٹکے دیے جائیں گے۔“

”ہاں! جانتے ہیں، لیکن اگر ہم نے اس کا نام بتا دیا تو پھر ہم تو مارے گئے بے موت۔ اس صورت میں ہمارے کام نہیں آسکے گا۔“

”اور نام ہم جان کر دیں گے۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”لگاؤ بھٹی۔ بجلی کے جھٹکے۔ جب تک یہ اس کا نام نہیں بتا دیتے۔ جھٹکے لگاتے رہو۔ یہ مرتے، میں تو مر جائیں اس لیے کہ انھوں نے صولت بیگ کی بیوی کو موت کے



نے گہرا کر کہا۔

”گگ۔ کیسے ہو جاؤں۔ یہ مجھے ہونے نہیں دے رہا۔“  
 ”حد ہو گئی۔ اور بھائی صاحب نے نامعلوم صاحب۔ آپ  
 ہی کچھ کریں نا۔“

”اچھی بات ہے۔ ابھی لیجیے۔ اس نے فوراً کہا۔  
 ”اور لیں کیا؟“

## سو فیصد غلطی

”یہ۔۔۔ یہ کیا۔ آفتاب! تم اُلٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا مطلب ہے۔ ایک منٹ کے لیے ٹھہریے۔ میں آئیہ  
 ”کیا مذاق ہے؟“  
 ”یہ مذاق میں نہیں۔ آئیہ کر رہا ہے۔ اس نے کانٹا۔“

”گگ۔ کیا مطلب؟ وہ ایک ساتھ بولے۔  
 ”مم۔ مجھے آئیہ نے پکڑ کر اٹھا کر دیا ہے۔“  
 ”یار کیوں مذاق کر رہے ہو؟ شوکی نے ڈرے ڈرے کر کے کہا۔“

”گگ۔ کیا مطلب؟ وہ ایک ساتھ بولے۔  
 ”مم۔ مجھے آئیہ نے پکڑ کر اٹھا کر دیا ہے۔“  
 ”یار کیوں مذاق کر رہے ہو؟ شوکی نے ڈرے ڈرے کر کے کہا۔“

”آئیہ حالت میں بھلا نہیں کیونکہ مذاق کر سکتا ہوں، اس لیے دراصل ایک جن میں۔ ان کے بیوی بچے بھی ان کے  
 وقت تو مذاق بھی اٹھا لگے گا۔“

”میں نے کہا تھا نا۔ اس عبادت میں نکلی منزل میں آئیہ جن اور اللہ کی عبادت ہے۔  
 کرائے پر رہتے ہیں۔“

”یار اب اس مذاق کو بند کرو۔ اور سیدھے ہو جاؤ۔ شوکی نے کہا۔  
 ”جنوں کا وجود تو قرآن سے ثابت ہے۔“

اور پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورۃ رحمن نازل ہوئی اور یہ الفاظ اترے کہ تم دونوں کے دونوں کب تک اپنے رب کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ تو اس میں **منا** نے فرمایا۔

دوسرے مخاطب جن ہی ہیں۔ اور جنوں نے فوراً ان الفاظ کا جواب دیا تھا کہ اے اللہ ہم کبھی بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کے الفاظ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سن سکتے تھے۔ آپ کو اس سے کیا۔ بس ہوں میں ٹی ایس ایم۔ ہوں گے۔ لیکن ان حروف سے آخر کیا نام بنتا ہے؟ ٹی ایس ملک۔

تو فرمایا تھا کہ جن آج تم سے بڑھ گئے۔ اسی طرف یہ بھی پورا نام نہیں بنتا۔ پورا نام بتائیے۔  
خانہ کعبہ میں مسجد جن موجود ہے۔ اس مسجد میں بھی غالباً چیلے میں آپ کی آسانی کے لیے تھوڑا سا فرق اور  
جنوں نے قرآن سنا تھا۔ لہذا جن لوگ عبادت کیوں نہیں کرنا دیتا ہوں۔ میرا نام طاہر ایس ایم ہے۔  
کر سکتے۔

”مان گئے آپ کو۔ آپ تو اچھے خاصے مولوی ہیں۔“

”نہیں۔ میں مولوی نہیں ہوں۔ مولوی تو اگر صبح معنی میں ہے۔ میں یہی کہلوانا پسند کرتا ہوں۔“

میں مولوی ہو تو بڑی چیز ہوتا ہے ، لیکن آج کل جھوٹے مولوی بھی بات ہے — ہم فی الحال اسی نام سے گزارا کر زیادہ ادب سچے بہت کم ملتے ہیں۔

”اے ایہ ہم کس بحث میں بڑ گئے۔ ہم تو یہاں آپ کے پاس پر لیا۔“  
 سے دو باتیں کرنے آئے تھے۔ اور ساتھ میں آپ جلد روز پہلے ہی سمجھ لیں۔“

”کام بھی جانا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ پہلے تعارف ہو جائے۔ میں ٹی ایس ایم۔“

کڑ بڑانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کچھ نہیں چھپا سکیں گے،

”اوہ ! اس قدر معلومات ہیں آپ کو۔ خیر۔ پھر بھی آپ کو چلنا ہو گا ہمارے ساتھ۔ دندنہ آپ تو ہو جائیں گے خزاں اور ہمدانی آئے گی مصیبت۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہیں ہوں گے لگا خزاں۔ خیر میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”ہاں ! یہ ٹھیک رہے گا۔ بہتر تھا کہ آپ اپنا پورا نام بتا دیتے۔“

”سوری ! میں بہت کم لوگوں کو اپنا پورا نام بتاتا ہوں۔“

”کیوں۔ کیا بہت خوف ناک نام ہے۔ لوگ سن کر ڈر جاتے ہیں؟ آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے منہ بنایا۔ آخر وہ اسے ساتھ لے نیچے آئے۔“

”جن بھائی۔ ذرا میرے اوپر دالے جھٹے کا خیال رکھنا، لوگ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔“

”ایک بار پھر خوفناک آواز گونجی۔ وہ کانپ کر رہ گئے۔“

”نہیں۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے دوست ہیں۔ ٹی ایس ایم نے کہا۔“

”کیا مطلب۔ کیا جن صاحب نے کچھ کہا ہے؟ آفتاب لرز گیا۔“

”ہاں ! یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ لوگ ذہدتی مجھے لے

صاف صاف بتا دیں۔ آخر ان کی نگرانی کی آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟

”آپ اسے میرا شوق کہ لیں۔“

”تب یہ بہت خطرناک شوق ہے۔ آپ جیل جا رہے ہیں۔ لیکن آپ کو بھی ایک بات معلوم نہیں۔ وہ سکرایا۔“

”اور وہ کیا؟“

”شوق دا کوئی ٹل نہیں ہوتا۔ اس نے پنجابی میں کیا کہا۔ میں پنجابی ذرا مشکل سے سمجھتا ہوں۔“

”شوق اٹھتا ہوتا ہے۔“

”ہو گا۔ انپیکٹر جمشید کی نگرانی کرنے کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے کسی دشمن کے ہیں۔ اور اس کے حکم پر نگرانی کر رہے ہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اتنا خوفناک مطلب نہ نکالیں۔ ٹی ایس ایم نے کانپ کر کہا۔“

”اچھا جناب ٹی ایس ملک صاحب۔ آپ کو ہم انکل کے سامنے پیش کریں گے۔ آپ کے بارے میں فیصلہ دیا جائے گا۔“

”کریں گے۔ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

”لیکن اس وقت انپیکٹر صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ ان کے تینوں بچے۔ صرف بیگم جمشید موجود ہیں۔“



ساتھ ساتھ رہیں۔ جہاں میں جاؤں۔ وہاں یہ بھی ساتھ جائیں  
 ایک بات بھی ہے۔

عین اس وقت دروازہ کھل گیا :

”السلام علیکم آئی۔“

”علیکم السلام۔ میں پہلے ہی جان گئی تھی کہ گھنٹی آفتاب

نے بجائی ہے۔“

”شکریہ آئی۔“

”اے ! یہ چٹا تم لوگوں کے ساتھ کون ہے؟“

”آپ کے مجرم۔“

”م۔ میرے مجرم۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

”یہ ٹی سی ایس ہیں۔“

”جی نہیں۔ میں ٹی سی ایس نہیں۔ ٹی ایس ملک ہوں۔ وہ

بھلا اٹھا۔“

”کیا ہیں؟ بیگم جمشید نے حیران ہو کر کہا۔“

”ٹی ایس ملک۔“

”گویا یہ نام ہے آپ کا۔ اور پورا نام کیا ہے آپ کا؟“

”جی۔ اسی نام سے ہی گزارا کر لیں۔“

”اور مزے کی بات یہ ہے آئی۔ یہ حضرت آپ کے گھر

کا نگرانی کر رہے تھے۔ انھیں یہ تک معلوم ہے کہ اس

جا رہے ہیں تو وہ دخل اندازی کرے۔ میں نے انھیں  
 دیا ہے۔ دروازہ ابھی آپ لوگ اُٹتے نظر آتے، کیونکہ یہ  
 دوستوں کے بہت دوست اور دشمنوں کے بہت دشمن ہیں۔“  
 ”ادہ اچھا۔“

”وہ گھر سے نکل کر انپکٹر جمشید کے دروازے پر آئے  
 آفتاب نے دستک دی۔ ایسے میں شوکی کی نظر پھر دُور بین  
 پڑی۔ وہ قدرے حرکت کر رہی تھی :

”اے بھئی۔ وہ ٹی بی ایس صاحب۔“

”ایک منٹ۔ میں ٹی بی ایس نہیں۔ ٹی ایس ملک ہوں۔ اس نے جھل کر کہا۔“

”تو ایسا نام رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اشفاق نے جل کر کہا۔  
 ”اب تو دکھائیگا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔“ اس نے بے چادگی کے  
 عالم میں کہا۔

”خیر۔ میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی دُور بین حرکت کر رہی ہے۔  
 کوئی بات نہیں۔ میرے جن دوست یہ دیکھ رہے ہیں کہ  
 کہیں میرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی۔“

”تب تو آپ بہت خطرناک ہیں۔“

”اتنا بھی نہیں۔ اس لیے کہ مشکل یہ ہے کہ یہ جن حضرات  
 اس مکان سے دُور کہیں نہیں جاتے۔ اگر یہ ہر وقت میرے

سامنے والا مکان۔ کیا آپ نے سر سفید رنگ کا مکان کرائے پر لیا ہے۔ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

جی ہاں! کیا آپ اس مکان کے بارے میں جانتی ہیں؟

ہاں۔ کیوں نہیں۔ وہ واقعی آسیب زدہ ہے۔  
لیکن صرف نیچے والی منزل۔ اوپر والی نہیں۔ اور جب سے میں نے یہ مکان کرائے پر لیا ہے۔ میرے حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ جن میرا دوست بن گیا ہے۔

لیکن اس سے پہلے تو سنا ہے، وہ لوگوں کو تنگ کرتا تھا۔  
یہ جن لوگ غلط لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اچھے لوگوں کو نہیں۔ اس نے کہا۔

بھائی صاحب اپنے مزے میاں مٹھو بن رہے ہیں۔ اشفاق نے مزہ بنایا۔

لیکن آپ ہمارے گھر کی نگرانی کیوں کر رہے تھے؟  
یہ میرا شوق ہے۔ میں صرف یہ دیکھتا ہوں۔ کون ملنے آیا، کون کس وقت گیا۔ شاید میری یہ نگرانی آپ لوگوں کے کام آجائے۔

اچھا پہلے یہ بتائیں۔ حیرال نے آکر کیا حرکات کی تھیں؟  
اس کے لیے مجھے رجسٹر لانا ہو گا۔ کیا مجھے اجازت ہے؟  
بھئی کیا خبر۔ آپ فراہ ہونے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔

وقت آپ گھر میں اکیلی ہیں۔

ادہ اچھا۔ پھر تو یہ حضرت خطرناک ہیں۔ وہ گھبرا گئیں۔

نہیں۔ نہیں آنٹی۔ میں خطرناک و طرناک ہرگز نہیں ہوں۔  
خاص طور پر آپ لوگوں کے لیے، آپ لوگوں کا تو میں دوست ہوں۔

یہ کیسی دوستی ہے۔ کہ دور میں ہمارے گھر کے سامنے فٹ کر رکھی ہے۔

آپ کے دشمنوں کا ریکارڈ رکھنے کے لیے۔ اس نے کہا۔  
ہمارے دشمنوں کا ریکارڈ۔ کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ میں نے ایک رجسٹر میں تمام باتیں درج کی ہیں۔ کچھ وقت پہلے جب وہ خوفناک آدمی آیا تھا۔ جس کے ساتھ ایک پیاری سی بچی تھی۔ تو اس وقت میں نے ان کی نقل و حرکت لکھی تھی۔

ادہ! وہ رجسٹر کہاں ہے؟

میرے آسیب والے مکان میں۔ اس نے کہا۔

اوہو۔ کیا ہر ایک مرتبہ یہ بات بتانا ضروری ہے۔ آفتاب نے جھٹکا کر کہا۔

اگر بتا دیا تو کیا جرم کیا ہے۔ اس نے تھلا کر کہا۔

کیا مطلب۔ آپ والا مکان۔ آپ کا مطلب ہے۔ وہ

”ٹھیک ہے۔ جائیں اور جلد رجسٹر لے آئیں۔“  
اس نے دوڑ لگا دی۔

”کیا چیز ہے یہ؟“

”دشمن کا کوئی جاسوس لگتا ہے۔“ اخلاق نے کہا۔

”ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔“ انکل  
کریں گے۔

جلد ہی وہ رجسٹر لے آیا۔ اور اسے کھولتے ہوئے بولا:

”یہ دیکھیے۔ اس خوفناک آدمی نے اس لڑکی کے ساتھ دروازے  
پر پہنچ کر کیا کام کیا تھا۔“

وہ رجسٹر پر جھک گئے اور پھر ان کی آنکھیں مارے حیرت  
پھیل گئیں۔

”آخر میں کون فراہ ہوں گا۔ کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟“  
”دوسروں کے مکانات کی نگرانی بھی جرم ہے، کیونکہ کسی  
سلسلے میں اگر نگرانی کرنے کی ضرورت ہو تو یہ کام قانون کے  
محافظ کریں گے۔ نہ کہ آپ۔“

”اوہ بس یہی میری غلطی ہے۔ بلکہ سو فیصد غلطی۔“ اس  
نے چونک کر کہا۔

”سو فیصد غلطی۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں آپ لوگوں کے کارنامے پڑھتا رہتا ہوں۔  
پڑھتا رہا ہوں۔ اور پڑھتا رہوں گا۔ لیکن اس پڑھنے کے  
پتھر نے مجھے ایک خیالی انسان بنا دیا ہے۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔  
”کیا مطلب۔ خیالی انسان؟“

”ہاں! خیالی انسان۔ میں خود کو انپکٹر جمشید، انپکٹر کامران مرزا  
وغیرہ خیال کرتا رہتا ہوں۔“

”حیرت ہے۔ تم نے کبھی خود کو شوکی تصور نہیں کیا۔“

”کیا ہے۔ لیکن بہت کم۔ اس لیے کہ اصلی ہیرو تو یہ ہیں۔“

”اے خبردار۔ آپ ہمیں نقلی ہیرو نہیں کر سکتے۔“

”اوہ سوری۔ اچھا تو کیا میں وہ رجسٹر لے آؤں؟“

”ہاں لے آئیں۔ لیکن فراہ ہونے کی کوشش نہ کرنا۔“

”میں نے جب کوئی جرم کیا ہی نہیں۔“



پروفیسر صاحب کا چچا زاد بھائی ہوں۔ کامران۔  
 ”اوہ اچھا۔ یہ کڑ کر آفتاب نے دروازہ کھول دیا۔  
 فوراً ہی اسے ایک زوردار دھکا لگا۔ وہ آٹ کر گرا،  
 انہوں نے دیکھا، اندر آنے والے چھ غنڈے تھے اور ان  
 کے ہاتھوں میں خوفناک قسم کی رائفلیں تھیں:  
 ”خبردار ہاتھ اوپر اٹھا دو، ورنہ پھلنی کر دیں گے۔“

## خوفناک خاموشی

دشک کی آواز سن کر پروفیسر ارسلان نے ان کی طرف دیکھا۔  
 ”یہ دشک میرے والد صاحب نے نہیں دی، دروازے پر  
 کوئی اور ہے۔“ آفتاب نے فوراً کہا۔  
 ”لیکن کون، سوال تو یہ ہے؟“ آصف بولا۔  
 ”یہ تو دروازہ کھلنے پر ہی پتا چل سکتا ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ آپ ایک طرف ہو جائیں۔ بلکہ اپنے بیٹے  
 سمیت ایک کمرے میں بند ہو جائیں۔ دروازہ اندر سے  
 بند کر لیں۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔“  
 ”اور باہر اگر خطرناک لوگ ہوتے؟“ پروفیسر ارسلان بولے۔  
 ”تب بھی ہم انہیں دیکھ لیں گے۔“  
 ”دو دنوں کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ بند ہونے کی آواز  
 سن کر وہ دروازے کی طرف آئے:  
 ”کون صاحب ہیں؟“ آصف نے کہا۔

”یہ بتاؤ۔ وہ کہاں ہیں؟“  
 ”ارے۔ ابھی ابھی تو ہیں تھے۔ حیرت ہے۔ کیس مکیاں  
 کر تو نہیں اڑ گئے۔“  
 ”انہوں نے بڑے بڑے منہ بناتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا  
 پھر بند دروازے کی طرف بڑھے:  
 ”اس کمرے کی طرف نہ جائیں۔ خدا کے لیے رک جائیں۔“  
 ”میں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔  
 ”کیا مطلب۔ اس کمرے میں ہے۔“ ایک غنڈے نے کہا

اور دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔

”دروازہ کھولو، ورنہ توڑ دیں گے۔“

”دروازہ نہ کھولے گا پروفیسر صاحب۔ آصف نے بلند آواز میں کہا۔

”خاموش رہو۔ ورنہ ہم پہلے تمہیں خاموش کریں گے، پھر دروازہ کھلوائیں گے۔“

”اوہ اچھا۔ لیجیے۔ ہم تو ویسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ آفتاب گھبرا گیا۔

”میں اس طرح خاموش کرنے کی بات نہیں کر رہا۔ موت کے گھاٹ اتار کر خاموش کروں گا۔“

”ارے باپ دے۔ اس قدر خوفناک خاموشی؟ آفتاب لرز گیا۔

”دروازہ کھول دو پروفیسر، ورنہ ہم توڑنا شروع کرتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں پروفیسر صاحب۔ چاہے کچھ ہو جائے۔“

”چاہے ہم تم لوگوں کو گولیوں سے کیوں نہ بھون دیں ایک غنڈے نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”ہاں! کیوں نہیں؟ آصف نے کہا۔

”تو پھر پہلے تم لوگ ہی جاؤ۔ سن لو پروفیسر۔ ہم ان لوگوں کو گولیوں سے بھون رہے ہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ اندر سے پروفیسر چلے گئے۔

”نہجدار پروفیسر انگل۔ چاہے اس طرف کچھ ہو جائے۔

آپ دروازہ نہیں کھولیں گے۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بہت مضبوط دروازے ہیں۔ آسانی سے نہیں ٹوٹیں گے۔“

”بل۔ لیکن۔ یہ آپ لوگوں کو۔“ پروفیسر اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

”آپ ہماری فکر نہ کریں۔ یہ لوگ ہمیں نہیں جانتے۔ بس آپ دروازہ نہ کھولیں۔“

”اچھا۔ لیکن میں آپ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُترتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”تو آپ دیکھنے کے قابل ہیں بھی نہیں۔ اس لیے کہ کمرے میں

نہ ہیں۔ اور اس دروازے میں کوئی جھری بھی نہیں ہے۔“

”آپ اس حالت میں بھی مذاق کر سکتے ہیں۔“

”ہاں! یہی تو ہماری عادت ہے۔“

”ان لوگوں کے جسموں میں سو سو گولیاں اتار دو۔ یہ بول نہیں مانیں گے۔“

”ان کی راتیں ان کی طرف تن گئیں۔ عین اس وقت

دروازے کی گھنٹی بجی۔ آفتاب، آصف اور فرحت کو یوں لگا

جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ کیونکہ یہ انداز

انیکٹر کامران مرزا کا تھا۔

”یہ — یہ کون آگیا؟“

”آپ کی طبیعت صاف کر دینے والے آئے ہیں“  
چمک کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ایک ساتھ بولے۔

”مطلب یہ کہ وہ آئے ہیں۔ جو آپ جیسوں کو ذرا بھی  
نہیں ڈالتے۔“

”ذرا کھولنا بھئی — دیکھتے ہیں — کون آئے ہیں۔ ایک نے  
انداز میں کہا۔

ایک گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا،  
کوئی نہیں تھا:

”ہائیں! باہر تو کوئی بھی نہیں ہے، پھر دروازہ کس نے کھولا؟“  
”آسیب نے۔“ آفتاب مسکرایا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ باہر نکل کر دیکھو۔ دوسرے  
دروازہ کھولنے والے سے کہا۔

”اوہ ہاں! ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔  
باقی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ چند سیکنڈ گزر گئے۔

باہر مکمل خاموشی رہی۔ اس پر اندر والوں میں سے ایک  
نے بلند آواز میں کہا:

”کہاں وہ گئے؟“

”شاید باہر جاتے ہی سو گئے۔“ آفتاب بولا۔

”دونے — تم دیکھو جا کر، لیکن احتیاط سے جانا۔“  
”تم فکر نہ کرو استاد۔“

اور دوسرا باہر کی طرف بڑھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس  
نے دائیں بائیں دیکھا، لیکن باہر نہ اسے اپنا ساتھی نظر آیا، نہ  
کوئی اور۔ اس کے منہ سے نکلا:

”اوسے باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔“  
”تو باہر نکل کر دیکھو نا۔“

وہ باہر نکل گیا۔ اب باقی اس کی طرف سے کوئی اطلاع  
ملنے کا انتظار کرنے لگے، لیکن اس کی طرف سے بھی کوئی جواب  
نہ ملا:

”حد ہو گئی۔ اب مجھے دیکھنا ہو گا۔“ اس نے کہا جو انہیں حکم  
دے رہا تھا۔ طیش میں آ کر وہ اندھا دھند انداز میں باہر  
نکل گیا۔

اب یہ تجھے تین رہ گئے۔ وہ دروازے کی طرف متوجہ تھے۔  
گویا انہیں ان کی طرف سے کوئی خطرہ ہی نہیں تھا۔ انہوں

نے موقع غنیمت جانا اور ایک ساتھ ان تینوں پر چھلانگیں لگا  
دیں۔ وہ الٹ کر گرے اور دوسرے لمحے ان کی کلاشن کوفیں



تینوں کے ہاتھوں میں تھیں :

تقاب کیا تھا اور پھر راتے میں ہی میں اسے چاہپ بیٹھا ، لہذا

میں نے اس سے سب اگلا لیا :

”جی کیا مطلب — کیا اگلا لیا ؟“

”انشادجہ میں ایک عدد اڑن طشتری گری تھی — پروفیسر صاحب کو اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے — جب کہ انشادجہ چاہتا ہے — یہ کسی کو کوئی بات نہ بتا سکیں۔“

”ٹھیک ہے — سوال تو یہ ہے کہ انہیں کیا معلوم ہے ؟“

”یہ تو اب ہم ان سے پوچھیں گے — دروازہ بند کر لو۔“

”آصف نے بیڑنی دروازہ اندر سے بند کر لیا :

”ہاں پروفیسر صاحب — اب بتائیں :

”اڑن طشتری واقعی گری تھی — اور انشادجہ کی حکومت اس

لاکو راز رکھنے کے چکر میں تھی — لہذا پہلے تو مجھے دھکی دی

گئی ، پھر میرے بیٹے کو اغوا کیا گیا — اس کے بعد یہ کارروائی

کی گئی۔“

”حالانکہ اس کارروائی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی :

”جی — کیا مطلب ؟“

”ذرا غور کرو — پروفیسر ارسلان ان کی بات مان چکے تھے ،

لہذا انہوں نے ان کا بیٹا واپس کر دیا — لیکن میں اس کے

دھڑکی دیر بعد چھ غنڈے بھیج دیے — آخر ان کی کیا ضرورت

”اب تم لاٹھ اوپر اٹھا دو — تم لوگوں کے تین ساتھی اب

اس قابل نہیں رہ گئے کہ تمہاری کوئی مدد کر سکیں — اس لیے

باہر میرے والد صاحب — یعنی انپیکٹر کامران مرزا ہیں :

”نہیں — نہیں —“ وہ خوف زدہ انداز میں چلائے —

”ابا جان ! اندر یہ لوگ اب ہمارے قابو میں ہیں —

کیا پوزیشن ہے ؟“

”یہ تینوں بے ہوش پڑے ہیں — باہر سے ان کی آواز سنائی

”بس تو پھر آپ بے دھڑک اندر آ جائیں۔“

وہ اندر آ گئے — دشمنوں کی کلاشن کوفیں اب ان کے ہاتھوں

میں تھیں ، وہ انہوں نے اندر لا کر ڈھیر کر دیں :

”پہلے میں ان تینوں کو اندر کھینچ لاؤں۔“ وہ بولے —

”جی بہتر ؟“

جلد ہی چھ کے چھ غنڈے بندھے پڑے تھے :

”کیسے مزاج ہیں دوستو — اور ہاں ! اب ذرا یہ بھی بتا دو

کہ یہ چکر کیا ہے ؟“ آفتاب نے کہا —

”میں بتا دیتا ہوں۔“ انپیکٹر کامران مرزا مسکرائے —

”آپ کیسے بتا سکتے ہیں ؟“ فرحت حیران ہو کر بولی —

”پروفیسر صاحب کے بیٹے کو لے کر آنے والے کامیاب نے

Uploaded By Muhammad Nadeem

بیش آگئی تھی۔ یا تو وہ بیٹا واپس نہ کرتے۔ اس بات نے مجھے چکرا دیا۔ یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے۔

”میں نے خیال کیا۔ اڑن طشتری کسی دوسرے سیارے سے آئی ہے اور کسی خرابی کی وجہ سے انشادج کی سرزمین پر گر گئی ہے۔ پہلے میں اس کو شہاب ثاقب خیال کرتا رہا تھا۔ برا مطلب ہے، جب وہ شروع میں نظر آئی تھی۔ کیونکہ بعض شہاب ثاقب آگ کی مانند سُرخ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟ آفتاب نے پریشان ہو کر کہا۔ یہ کہ۔۔۔ پروفیسر صاحب ہمیں بتائیں گے۔ یہ جکر کیا ہے؟ میں بتا چکا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ وہ مسکرائے۔

”ہوں! پھر آپ نے انشادج کی رصدگاہ کے انچارج ایم کو فون کیا، لیکن اس نے اڑن طشتری کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ اور پھر اخبارات میں بھی کوئی نظر نہ پڑا۔ اس طرح آپ اور اُلجھن میں مبتلا ہو گئے۔“

”تب پھر اس بات کی ٹیگ سمجھا دیں کہ جب انھوں نے آپ کا بیٹا واپس کر دیا تھا تو ساتھ ہی چھ غنڈے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو بھیجنے والے بتا سکتے ہیں۔“

پھر۔۔۔ اس کے بعد کیا ہوا؟

”اچھا وہ فلم ہمیں پھر دکھائیں۔“

اس کے بعد اچانک انھوں نے میرے بیٹے کو اغوا کر لیا۔ آپ نے رپورٹ درج کرائی؟

”وہ انھیں سٹوڈیو میں لے آئے اور فلم لگا دی۔ فلم ختم ہوئی تو انھوں نے کہا:

نہیں۔ میں ان کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔“

”کیا آپ کو بس اتنا پتا ہے کہ ایک عدد اڑن طشتری انشادج کی سرزمین پر گر رہی ہے؟“

”آپ نے اس واقعے کو جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کیا خیال کیا؟“

”اے! اور انشادج اسی بات کو چھیٹا چاہتا ہے۔ وہ فوراً بولے۔“

”یہ کہ... وہ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔“

”جی نہیں پروفیسر صاحب۔ انشادج کو ایسی کوئی خبر چھپانے کا قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ ایسی خبریں تو اس

”آپ کوک کیوں گئے۔ خیر تو ہے؟ وہ فوراً بولے۔“



نے خود اُن گنت مرتبہ شائع کی ہیں۔ جب بھی کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان کے اخبارات نے خوب اُچھالا۔ زور شور سے شائع کیا۔

## ٹیڑھی کھیر

”تب پھر کیا بات ہے۔ یہ آپ بتا دیں۔“ وہ جھلا کر بولے۔  
 ”ہاں! میں ضرور بتاؤں گا۔ اس مرتبہ اڈن طشتری میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق بھی آئی تھی۔ انشارجہ دراصل اس آدمی کو چھپانا چاہتا تھا۔“  
 ”نہیں۔“ پروفیسر چلا اُٹھے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوں سے بھیل گئیں۔

فادون اور فرزانہ جونہی تجربہ گاہ میں داخل ہوئے، غلام گرمائی ان کے سامنے آ گیا۔  
 ”آخر تم لوگ پھر یہاں آ گئے۔“

”اُف مالک! یہ آپ ہیں۔ خادم گرمائی۔“  
 ”ہاں! یہ میں ہی ہوں۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔  
 ”آخر یہ چکر کیا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“  
 ”تجربہ گاہ پر قبضہ۔ اور وہ اس وقت ہمارا ہے۔“  
 ”کیا آپ پہلے سے اس پروگرام پر عمل پیرا ہو چکے تھے؟“  
 ”ہاں! بالکل۔“

”گویا پہلے آپ نے پروفیسر داؤد سے دوستی گناٹھی۔ یہاں آنا جانا شروع کیا اور آخر آج یہ حرکت کر ڈالی۔ لیکن اس طرح بھلا آپ کب تک قبضہ کیے رہیں گے؟“  
 ”زیادہ دیر قبضے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں بس ایک چیز



"اسے ان کے پاس ڈال دو۔"  
انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔  
اور پھر وہ خادم گرمائی کی طرف دیکھنے لگے :  
"آپ عجیب آدمی ہیں۔"  
"عجیب دشمن کہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔"  
"چلیے یہی سہی۔"

"ان دونوں کو باندھ دو۔ اور اس تیسرے کو بھی۔"  
کہیں یہ ہوش میں آ کر کوئی شرارت نہ کر جائے۔ یہ لوگ  
شرارتیں کرنے کے بہت شوقین ہیں۔"  
"او کے سر۔"  
"لیکن ہم خود کو نہیں بندھوائیں گے۔"  
"بھئی مشکل ہے۔ باندھے، بغیر ہم اپنا کام آرام سے  
نہیں کر سکیں گے۔"  
"تو، ہمیں اس سے کیا۔"  
"اس صورت میں مجھے لاتھ پیر ہلانا پڑیں گے۔"  
"تو ہلاؤ۔ روکا کس نے ہے۔"  
"اچھا تو پھر آؤ۔"  
"یہ کہہ کر وہ ان دونوں کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اس  
پر چلے کے لیے تیار ہو گئے۔"

کی تلاش ہے۔ جونہی وہ ملی۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"  
"اوہ۔ اور وہ کیا چیز ہے؟"  
"یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔ تم خود ذہن دوڑاؤ۔"  
پروفیسر داؤد کو ہوش میں لا کر معلوم کر لو۔"  
"نہیں۔ ہم آپ سے معلوم کریں گے۔"  
"ضرور۔ کوشش کر دیکھو۔"

دونوں نے ایک ساتھ اس پر پھلانگ لگائی اور پھر حیران  
رہ گئے، کیونکہ وہ اس سے نہیں کرا سکے تھے۔ جب کہ  
انہوں نے بہت جگے تلے انداز میں پھلانگ لگائی تھی۔ وہ اپنی  
جگہ سے صرف چند انچ ہٹ کر کھڑا مسکرا رہا تھا :  
"بہت خوب مسٹر خادم گرمائی۔ آپ بہت ماہر ہیں۔ مان گئے ہیں۔ ارے۔ یہ محمود کہاں رہ گیا؟ فاروق چونکا۔  
"بہ چارہ باہر خاک پھانک رہا ہو گا۔ خادم ہنسا۔  
"کیا مطلب؟"  
"جب آدمی منہ کی کھاتا ہے تو خاک ہی پھانکتا ہے نا۔"  
"کیا مطلب۔ کیا محمود بھی باہر منہ کی کھا چکا ہے؟"  
"ہاں ! ابھی دکھا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے منہ سے  
ایک عجیب سی آواز نکالی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور ایک  
شخص بے ہوش محمود کو ہاتھوں پر اٹھائے اندر داخل ہوا :

”آؤ آؤ۔ گرد مجھ پر وار۔“

ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”آپ۔ آپ انسان ہیں یا لولا؟“

”لولا تو میرے آگے پانی بھرتا ہے۔ خیر۔ اب ذرا ایک لٹاؤ میرا بھی سہ کر دکھاؤ۔“

”مردود کیوں نہیں۔ اگر آپ ہمیں ایک ایک لٹاؤ دے کر سکتے ہیں تو کر کے دکھائیں۔“

”وہ اچانک حرکت میں آیا۔ انھیں سنبھلنے کا موقع بھی مل سکا۔ ان کے سروں پر ایک ایک لٹاؤ پڑا اور پھر کبھی ہوش نہ رہا۔“

ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے میں بند پایا، لیکن انھیں دیووں سے باندھا نہیں گیا تھا، ایسے ہی ڈال دیا گیا تھا۔ اور ان کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ محمود بھی ہوش میں تھا۔

”یہ خادم گرمائی ہسپتال میں نہیں آیا۔ فاروق بولا۔“ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہم تجربہ گاہ کے ہی ایک کمرے میں بند ہیں، گویا خادم گرمائی صاحب بھی ابھی تک یہیں موجود ہیں۔“

”اور آبا جان کہاں ہیں۔ انھیں تو تجربہ گاہ میں ہونا چاہیے تھا، کیا ابھی تک انھیں پروفیسر انکل کی پراسرار بے ہوشی

دونوں نے ایک بار پھر خوب سوچ سمجھ کر اس پر چلائی اور چھلانگ ان کے اپنے خیال کے مطابق بہت خوفناک تھی اور خالی نہ جانے والی تھی۔ لیکن ہوا کی دھماک کے وہی تین پات۔ وہ فرش پر آکر گرے اور گرمائی ایک چھلانگ لگا کر ان کے سروں پر سے ہوتا ہوا ان کی کمر کی طرف آکر کھڑا ہو گیا۔ فرش سے اٹھ کر پھر اس کی طرف مڑے۔“

”اس میں شک نہیں کہ آپ لڑائی میں بہت ماہر ہیں لیکن ہم بھی ضد کے پکے ہیں۔“

”آؤ بھئی آؤ۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ خادم گرمائی ہنسا۔

”ترکیب نمبر ۱۲۔“ فردانہ بولی۔

اور وہ فوراً مختلف سمتوں میں کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا بھئی؟“ خادم مسکرایا۔

”ہمارا وار روکنے کے لیے تیار ہو جاتیں۔“

اور پھر انھوں نے مختلف سمتوں سے اس پر چھلانگ لگائی۔ اس بار خادم گرمائی نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس سے ٹکرا کر دور جا گرے۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ کسی لوہے کے ستون سے ٹکرا گئے ہوں۔



مشر جیرال ایسے ویسے لوگ تو چھنے سے رہے۔

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ یہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟“

”یہ بات تم لوگوں کو اس وقت معلوم ہوگی۔ جب مشر جیرال اپنے منصوبے کو مکمل کر چکے ہوں گے۔“

”کیا مطلب؟ وہ چونکے۔“

”مطلب یہ کہ جو منصوبہ وہ لے کر آئے ہیں۔ جب اس

پر عمل کر چکے ہوں گے اور جب اس کا نتیجہ سامنے آئے گا،

اس وقت تم لوگوں کو پتا چلے گا۔ اور اس وقت پتا چلنے کا

آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”بات پلے نہیں پڑی۔“

”میں مثال کے طور پر سمجھاتا ہوں۔ فرض کیا۔ مشر جیرال

اس تجربہ گاہ کو بم سے اڑا دینے یا آگ لگا دینے کا منصوبہ

کرے۔ جب تجربہ گاہ اڑ جائے گی یا آگ سے جل

کر راکھ ہو جائے گی تو اس وقت آپ کو پتا چلے گا۔ ظاہر

ہے، آپ اس وقت کیا کر سکیں گے؟“

”نہیں۔ تہ۔ تو کیا مشر جیرال تجربہ گاہ کو اڑانے

”نہیں۔“

”یہ بات میں نے مثال کے طور پر کہی ہے۔“ خادم گرمائی مسکرایا۔

کی بھی اطلاع نہیں ملی۔ آخر کو ہمیں بھی تو انھوں نے

ادھر بھیجا تھا۔“

”پتا نہیں کیا چکر ہے۔“

”عین اس وقت دروازہ کھلا اور خادم گرمائی کی شکل نظر آئی۔“

”وہ مسکرا رہا تھا۔“

”اب کیا حال ہے دوستو؟“

”ٹھیک ہے۔ آپ سنائیں۔“ فادوق خوش گوار لہجے میں بولا۔

”میں خیریت سے ہوں۔ تجربہ گاہ پر اس وقت میرا

ہے۔“ پروفیسر صاحب اور ان کے ماتحت ہسپتال میں بے

پڑے ہیں۔ انپکٹر جمشید کا دور دورہ پتا نہیں۔ کیوں

دہی؟ وہ مسکرایا۔“

”آپ چاہتے کیا ہیں؟ محمود بولا۔“

”میں کیا چاہتا ہوں۔ شاید یہ بات تو میں خود بھی نہیں

اس رومال کے بارے میں ہی بتا دیں۔“

”رومال کے بارے میں صرف اور صرف مشر جیرال

سکتے ہیں۔ میں تو ان کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔“

”خادم تو آپ ویسے بھی ہیں۔ ویسے یہ جان کر حیرت آئے ہیں؟“

”ہوئی اور خوشی بھی کہ آپ کا تعلق مشر جیرال سے ہے۔“

آپ لڑائی بھڑائی اور طاقت میں اس قدر بڑھ چڑھ کر ہیں۔“



”آپ مسٹر جیرال کے مقامی ساتھی ہیں یا اناکارج سے ان  
ساتھ آئے ہیں؟“

”میں یہیں رہتا ہوں۔ جب ان لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے  
مجھ سے رابطہ کر لیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے۔ تم غدار ہو۔“ محمود نے جل کر کہا۔  
”غدار کیسے؟ وہ سکرایا۔“

”اپنے ملک اور قوم کو نقصان پہنچا رہے ہو یا نہیں؟“  
”نہ یہ میرا ملک ہے اور نہ اس ملک کے رہنے والے ہیں۔“  
”قوم ہیں۔ اس نے منہ بتایا۔“

”کیا مطلب؟“

”جب یہ ملک بنا تھا۔ تو اس وقت مہاجرین کے  
میں بہت سے غیر مسلم بھی یہاں بھیج دیے گئے تھے۔  
لوگ آج تک اس ملک کی جاسوسی کرتے ہیں۔“

”اوہ نہیں۔ وہ بولے۔“

”میں ان میں سے ایک ہوں۔“ خادم گرمائی نے کہا۔

”لیکن آپ جیرال کے لیے کام کرنے کیسے لگ گئے، کیا آپ  
معلوم نہیں کہ جیرال کب کا مرچکا ہے۔“

”ہمیں تو بس اوپر کے احکامات پر عمل کرنا پڑتا ہے۔“

”ہمیں حکم ملا۔ مسٹر جیرال آ رہے ہیں، ان کے احکامات

میںوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اس کے  
بچے جل پڑے۔ جلد ہی وہ تجربہ گاہ کے پیچھے لگائے گئے

”بھل کرنا ہوگی۔ بس ہم نے تعمیل شروع کر دی۔“  
اور یہ سوچنے کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ جو شخص مرچکا  
وہ کیسے آ سکتا ہے؟

”نہیں! اس لیے کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔“

”اور مسٹر جیرال تجربہ گاہ کو اڑانے آئے ہیں؟“

”یہ کیا مشکل کام ہے۔ پروفیسر دادو کی تجربہ گاہ تو ایک  
سہولت سا ایجنٹ اڑا سکتا ہے۔ مسٹر جیرال جیسے لوگ  
لے لے رہے ہیں۔“

”تو پھر وہ ایسی کون سی چیز اڑانے آئے ہیں؟“

”بتا نہیں۔ وہ کیا منصوبہ لے کر آئے ہیں۔ مسٹر جیرال کا  
اصول ہے۔ اپنے منصوبے کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے،  
وقت ہم ان کے ایک حکم کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ کیا  
لوگ یہ نظارہ دیکھنا پسند کریں گے؟“

”ہمیں کیا معلوم۔ وہ نظارہ کیا ہوگا، کیسا ہوگا؟ فاروق  
نے منہ بناتے ہوئے کہا۔“

”میں بتاؤں گا۔ آنا ہے تو آجائیں۔ یہ کہہ کر وہ جانے  
لے مڑ گیا۔“

”تب پھر۔۔۔ اس نے کیا کہا؟“

”اس نے کہا۔ مجھے قتل کر کے بہت مزا آتا ہے۔ لہذا میں خود کو روک نہیں سکتا۔“

”کیوں! یہ بات ٹھیک ہے؟“

”ہاں! میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔“

”لیکن مسٹر جیرال کو ایسے لوگ پسند نہیں۔ جو حکم کی خلاف ورزی کریں۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گروہ میں رکھنے کا عادی نہیں ہے۔“

”تب پھر آپ مجھے گروہ سے نکال دیں۔“

”مسٹر جیرال کا ایک اصول اور ہے۔ حکم عدولی کرنے والے کو مزا ضرور دیتے ہیں۔ اگر تم نے یہ حکم عدولی کرنے سے پہلے گروپ سے نکال دیے جانے کی درخواست کی ہوتی تو وہ خوشی سے تمہیں فارغ کر دیتے۔ لیکن اب نہیں۔ اب تمہاری مزا صرف اور صرف موت ہے۔ پھانسی کا پھندا تیار ہے۔ اور مسٹر جیرال کا حکم ہے کہ تمہیں ہر حال میں پھانسی دی جائے۔“

”نہیں۔ میں ان سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔“

”وہ معاف کرنے کے عادی نہیں۔ اسے پھانسی کی سزا دے دی جائے۔“ خادم نے کہا۔

باغ میں تھے۔ اس باغ کے ارد گرد بہت اونچی دیواریں تھیں اور ان سے بھی اونچے سفیدے کے درخت تھے۔ گویا بھرپور دوہری دیوار کے اندر تھے۔ اس باغ کے درمیان میں ایک ستون کھاڑا گیا تھا۔ اس ستون سے پھانسی کا ایک پھندا لٹکا رہا تھا۔ باغ میں اس وقت بیس کے قریب غنڈہ صورت لوگ موجود تھے۔ ایک آدمی اس ستون سے بندھا ہوا تھا۔ ”تو یہ ہے وہ؟“ خادم گرمائی نے بندھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔

”وہ تمہرے کا بیٹے لگا۔“

”بیس سر۔ وہ یہی ہے۔“

”کیا مسٹر جیرال کا تمہیں یہ حکم نہیں ملا تھا کہ صولت بیگم اس کی بیوی کو اغوا کرنا ہے۔ اور بس۔“

”جج۔ جی ہاں! ان کا یہی حکم ملا تھا مجھے۔“

”تب پھر تم نے اس کی بیوی کو ہلاک کیوں کیا؟“

”م۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

”کیوں بھٹی۔ کیا اس نے ایسا غلطی سے کیا؟“

”نہیں۔ نو سر۔ ہم نے اسے روکا تھا۔ اور یاد دلایا کہ مسٹر جیرال کا حکم دونوں کو اغوا کرنے کا ہے۔ قتل کرنے کا نہیں ہے۔“



اس کے بدن میں تھر تھری دوڑ گئی۔ اس کے ساتھی اسے کھولنے لگے۔

”تم لوگوں نے دیکھا۔ مشرجیرال اپنے آدمی کو یہ سزا دی کہ اس لیے دے رہے ہیں کہ اس نے ان کے ایک دشمن یا غلام شخص کی بیوی کو ہلاک کر دیا ہے۔“

”ہم جانتے ہیں۔ مشرجیرال اپنے اصول کے کتنے پابند ہیں۔ یہ بات ہمارے تجربات میں آچکی ہے۔“

اسی وقت اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا اور اس کا دھڑ چھوڑ دیا گیا۔ اس کا جسم پیڑ کے لگا۔ چند منٹ بعد وہ ساکت ہو گیا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے یہ نظارہ دیکھا۔ وہ اس شخص کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ ایک تو وہ خود قاتل تھا ایک بے قصور کو اس نے بلا وجہ قتل کر دیا تھا۔ دوسرے اگر وہ کسی دہ سے اسے پہچانا بھی چاہتے تو خادم گرمائی انھیں ٹیڑھی کھیر نظر آ رہا تھا۔

”تم لوگوں نے دیکھا؟ خادم بولا۔“

”ہاں! دیکھا۔ اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”اس سزا سے تم لوگ بچ سکتے ہو۔ اگر مشرجیرال کی ایک شرط مان لو۔“

”کب۔ کیا مطلب؟ وہ زور سے اُچھلے۔“

”مشرجیرال کی شرط یہ ہے کہ تم لوگ نومنی کو وزیر داخلہ کو مجبور کرو کہ وہ ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کرے۔ جس میں بھی بڑے آفیسر شریک ہوں۔“

اس شرط نے انھیں حیرت میں مبتلا کر دیا۔



بہی ان لوگوں کو رہا کرنا ہو گا۔  
 یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ ان لوگوں نے ایک صحافی کو  
 اور اس کی بیوی کو قتل کیا ہے۔  
 کیا جرم ثابت ہے؟

یس سر۔

کیا!!!

تب تم فوراً انھیں عدالت میں پیش کر دو۔  
 اؤ کے سر۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ صبح انھیں  
 عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔  
 لیکن پانچ کو نہیں۔ چھ کو۔ اس لیے کہ تم پر الزام ہے  
 نے چھ بے گناہ لوگوں کو گرفتار کیا ہے۔

یہی بات ہے۔ میں چھٹے کو بھی ان شاء اللہ عدالت میں  
 کے ساتھ پیش کر دوں گا۔  
 بہت خوب! شکریہ جمید۔

اور انھوں نے ریسور رکھ دیا۔  
 میں بھی۔ تو تمہارے ساتھ کوئی چٹا بھی تھا؟  
 اسی نے صولت کی بیوی کو قتل کیا تھا۔ ورنہ ہمیں  
 رست اغوا کرنے کا ملا تھا۔  
 پھر اس نے قتل کیوں کیا؟  
 کیلئے کہ وہ قتل کرنے کا جنون رکھتا ہے۔ بس اپنے

انیکٹر جمید نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ریسور اٹھا  
 لیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی آئی جی شیخ نشاد احمد کی آواز  
 سنائی دی:

”یس سر۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟“  
 ”جمید تم نے چھ آدمیوں کو گرفتار کیا ہے اور انھیں گرفتار  
 کر کے یہاں لائے ہو۔ تم اس بات سے انکار تو کرو گے  
 نہیں۔ میں جانتا ہوں۔“

”تھوڑا سا فرق ہے سر۔ انیکٹر جمید مسکرائے۔  
 ”کیا مطلب؟ آئی جی چونک اٹھے۔  
 ”میں نے چھ نہیں، پانچ آدمی گرفتار کیے ہیں۔“  
 ”ادھو اچھا۔ تب پھر چٹا کدھر گیا؟“  
 ”اس کا مطلب ہے۔ کوئی چٹا بھی تھا۔ اور وہ ہماری  
 نظروں میں نہیں آ سکا۔ لیکن معاملہ کیا ہے سر؟“

جنوں نے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔  
 "وہ کہاں ہے؟"

"قتل کے بعد جب اسے ہوش آیا کہ کیا کر بیٹھا۔  
 تو باس کے خون سے فوراً ہم سے اگ ہو گیا، کیونکہ ان حکومت کے لوگ خادم گرمانی سے اس قدر خوف زدہ  
 بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔  
 میں نے پوچھا ہے۔ وہ ہمیں کہاں ملے گا؟"

"خادم گرمانی ہمارے باس ہیں۔ انھوں نے اب تک میرے لیے میں انھیں پروفیسر دادد اور اس رومال کا خیال آیا۔  
 اسے پکڑوا لیا ہو گا۔ کیونکہ وہ حیرت انگیز طور پر میں نے پہلے گھر فون کیا، لیکن بیگم جمشید کو کچھ پتا نہیں  
 چالاک ہیں۔ فوراً سراغ لگا لیتے ہیں۔ لہذا جہاں خادم لہذا انھوں نے تجربہ گاہ میں فون کیا۔ گھنٹی کافی دیر  
 گرمانی ہوں گے، وہیں چھٹا ہو گا۔ ایک نے کہا۔  
 "اور چھٹے کا نام کیا ہے؟"

"راجا کا نو" اس نے بتایا۔  
 "ٹھیک ہے۔ میں اس کا سراغ لگا لوں گا۔ اب صبح تم لوگ دیا ہو۔  
 کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔  
 "کیا!! وہ خوش ہو گئے۔"

"اس قدر خوش ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آخر ہمارے پراسرار باس نے اپنا کام دکھا دیا۔  
 تمہارا مطلب ہے۔ خادم گرمانی؟ وہ بولے۔  
 "نہیں۔ خادم گرمانی نے حکومت کے کئی بڑے بڑے آدمیوں

وہاں میں کر دکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑا آدمی ہمدانی  
 طاقت کا ذمے دار ہے۔ اگر ہمیں کچھ ہو جاتا ہے تو وہ بڑا  
 خادم گرمانی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔  
 "کیا!! وہ چلائے۔"

"خیر۔ دیکھتے ہیں۔ کیا ہوتا ہے۔"

"لیکن بیگم جمشید کو کچھ پتا نہیں  
 لیکن کسی نے ریسور نہ اٹھایا۔"

"اکرام تجربہ گاہ میں گڑ بڑ ہے۔ ان لوگوں کو یہیں بند کر  
 اور آؤ تجربہ گاہ ہو آئیں۔ کہیں اس رومال نے کام  
 کر دیا ہو۔"

"بلکہ یہی وہ تجربہ گاہ کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ابھی  
 سے کچھ فاصلے پر تھے کہ انکسٹر جمشید نے کہا،  
 "اکرام۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے۔ تجربہ  
 میں خطرہ ہے۔ لہذا ہم گاڑی لے کر سیدھے دروازے  
 پر نہیں جائیں گے۔"



”تب پھر؟ اکرام بولا۔

”تجربہ گاہ کے پچھلی طرف جو باغ ہے، اس طرف سے جائیں۔“

”لیکن سر۔۔۔ اس طرف کوئی دروازہ نہیں ہے اور دیوار بہت اونچی ہیں، سفیدے کے درخت دیواروں سے بھی اونچے ہیں۔“ اکرام نے کہا۔

”یاد کوئی بات نہیں۔ دیسے تم اپنے عملے کو فون کرو۔ وہ فوری طور پر تجربہ گاہ کو اپنے گھیرے۔ میں لے لے دروازے پر موجود نگرانوں کو بھی گرفتار کر لے۔“

”جی کیا فرمایا۔ انھیں گرفتار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اکرام! ہمارا مقابلہ جبرال سے ہے۔ اس کا ایک طریقہ ہے کہ کئی سمتوں سے بیک وقت وار کرتا ہے۔ جب کہ یہ پتا نہ کیا گیا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ بلکہ کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ تو خود ہم سے ملاقات لے لے آ گیا تھا۔ ورنہ ہمیں تو پتا بھی نہ چلتا کہ ہمارے خلاف یہ جو پُر اسرار چکر شروع ہوا ہے۔ اس کی تہ میں کس دماغ کام کر رہا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ کہہ کر اکرام وائریس پر ماتحتوں کو ہدایات دینے لگے، پھر وہ گاڑی سے اتر کر تجربہ گاہ کی پچھلی طرف چل پڑے۔ انپکٹر جمشید سیدھے ایک درخت

طرف گئے، جیب سے ریشم کی باریک ڈوری نکالی، اس کے سرے پر لوسے کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ انھوں نے اس درخت کی ایک شاخ کی ایک طرف اچھالا۔ ہک شاخ پر سے ہوتا ہوا ان تک آ گیا۔ اب انھوں نے ہک میں گرہ لگائی اور رسی کو کھینچا۔ ہک اوپر جا کر شاخ کے گرد کس گیا۔ انھوں نے اپنا پورا وزن رسی پر ڈال کر اس کی مضبوطی کو چیک کیا اور پھر اس پتلی رسی پر چڑھنے لگے۔ اکرام کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں، کیونکہ رسی اگر دیوار کے ساتھ ہوتی تو اور بات تھی۔ اس صورت میں دیوار پر پیر ٹکائے جا سکتے تھے اور چڑھا جا سکتا تھا، لیکن فضا میں فلی ہوئی ریشم کی بالکل پتلی ڈوری، جس میں گرہیں بھی نہیں لگی ہوئی تھیں۔ اس پر اوپر چڑھنا قریب قریب ناممکن تھا، لیکن انپکٹر جمشید بہت آسانی سے چڑھ رہے تھے۔

جلد ہی وہ درخت تک پہنچ گئے اور شاخ پر جالیٹے، صرف چند سیکنڈ تک سانس لینے کے بعد وہ اس شاخ سے ہوتے ہوئے دیوار کے نزدیک پہنچ گئے۔ شاخ دیوار سے قدرے اونچی تھی۔ پہلے انھوں نے رسی شاخ سے اتار لی، پھر اندازہ قائم کیا اور دیوار پر چھلانگ لگا دی۔ اب رسی اندر کی طرف ٹٹکائی۔ ہک کو دیوار میں پھنسا یا،



اکرام کو اشارہ کیا کہ وہ باہر کے معاملات کو سنبھالے اور دروازے کی طرف چلا جائے۔ اکرام فوراً حرکت میں آگیا اور وہ دی پر سے پھسلے باغ میں آ رہے۔ باغ کے درمیان میں انھیں کچھ لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ شہود غروب ہو چکا تھا۔ اور اس طرف مکمل تاریکی تھی۔ جب کہ باغ کے درمیانی حصے میں روشنی تھی۔ وہ درختوں اور پودوں کی ادٹ لیتے اس طرف بڑھنے لگے۔ نزدیک پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ ایک لاش اسی سے جھول رہی تھی اور چار آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ آخر جگر کاٹتے وہ اس دروازے تک پہنچ گئے جو اندر جانے کے لیے تھا۔ وہ اس سے ہو کر اندر پہنچ گئے۔ تجربہ گاہ کا دروازہ انھیں کھل نظر آیا اور اندر باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ محمود حیرت زدہ آواز میں کہہ رہا تھا:

"کیا مطلب۔ آخر آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

"بس تمہیں اس سے کیا۔ تم صرف اس بات کا وعدہ کرو کہ اس دعوت کا اہتمام کر دو گے اور یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔"

"کیا فرمایا۔ رخصت ہو جائیں۔ چاہے ہم وعدہ کر کے چلے جائیں اور یہ کام نہ کرائیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم انسپکٹر جمشید کی اولاد ہو۔ اگر وعدہ کر کے

جاؤ گے تو پھر کام بھی کراؤ گے۔"

"تب پھر۔ جب تک آپ ہمیں بتا نہیں دیتے کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ اس وقت تک ہم وعدہ نہیں کریں گے۔"

"اور اگر تم وعدہ نہیں کرو گے تو پھر تم لوگوں کی لاشیں بھی اسی طرح کھتی نظر آئیں گی۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟"

"بات قصور کی نہیں۔ مسٹر جیرال کے منصوبے کی ہے۔"

"میں اس وقت انسپکٹر جمشید دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے، انھوں نے دیکھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ سے باتیں کرنے والے کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ جب کہ ان تینوں کے رخ اس کی طرف تھے۔ لہذا ان کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے انھیں دیکھ لیا۔ انھیں حیرت ہوئی۔ کہ نہ تو وہ گھبرایا، نہ اچھلا۔ نہ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔"

"مسٹر جیرال پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اس موقع پر آپ یہاں پہنچ جائیں گے، لہذا میں نے آپ کے استقبال کی پہلے ہی تیاریاں کر رکھی ہیں۔ آپ ذرا اوپر دیکھ لیں۔"

"انھوں نے اوپر دیکھنے سے پہلے ایک الٹی چھلانگ لگائی اور دروازے کے باہر جا کر گرے۔ ساتھ ہی وہ پلٹے۔ اب

آواز منہ سے نکالی۔

”کیا کہا۔ خادم گرمائی؟“ انیکٹر جمشید نے مارے حیرت کے کہ  
 ”کیوں آبا جان۔ آپ خیران کیوں ہو گئے؟“  
 ”ارے بھئی یہ مسٹر جیرال ہیں۔“  
 ”کیا!! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔  
 ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔“

ان کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آیا:

”ہاتھ اُدپر اُٹھا دو۔ اُدپر میں بعد میں دیکھوں گا۔“  
 ”اس کی ضرورت نہیں؟“ خادم گرمائی مسکرایا۔  
 ”کیا مطلب۔ کس کی ضرورت نہیں؟“

”اس کی۔۔۔“ اس نے پستول کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”آپ شاید جانتے نہیں۔ میری گولی ضائع نہیں جاتی۔“  
 ”اب ضائع ہی جائے گی۔ فائر کریں۔“

اس وقت تک محمود، فاروق اور فرزاد درمیان سے ہٹ گئے تھے۔ اپنے والد کو دیکھ کر ان کے چہروں پر رونے لگتی تھی۔ اسی وقت انیکٹر جمشید نے ایک فائر کیا۔ گولی کی آنکھ پر لگی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے حرکت کرنے ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ گولی اچٹ کر اسی رفتار سے ان کی طرف آتی تھی، لیکن وہ خود کو اس سے بھی بے فرس پر گرا چکے تھے۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے۔ والا شخص بلاوجہ دعویٰ نہیں کر رہا۔

ادھر انھیں گولی سے بچتے دیکھ کر خادم گرمائی حیرت رہ گیا:

”بہت خوب! آپ کو بھی ماننا پڑتا ہے۔“

”تو مان لیں نا انکل خادم گرمائی صاحب؟“ فاروق نے



شوکی نے اس کو اتار لیا۔ پھر وہ پائیں باغ میں آئے۔  
باغ والی کھڑکی پر عیسیاہ بٹن لگا تھا۔ انھوں نے اس  
کو بھی اتار لیا۔ اب دونوں بٹن لے کر اندر آئے۔ بیگم  
جمید ان بٹنوں کو دیکھ کر اچھل پڑیں:

”حیرت ہے۔ آوازیں سننے کے لیے ان کو تو گھر کے اندر کہیں  
چپکا دیا جاتا ہے۔ اور حیرال نے باہر چپکائے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔ یہ اور زیادہ جدید ہوں اور باہر لگا دینے  
پر بھی اندر کی آوازیں پہنچ کر لیتے ہوں۔ اگر مٹرائی ایس ایم  
صاحب اس کی اس کارروائی کو نوٹ نہ کر لیتے تو ہمیں اس  
کے بارے میں ہرگز پتا نہ چلتا۔ ویسے بھئی۔ یہ حضرت خود  
بھی تو حیرال کے آدمی ہو سکتے ہیں۔“

”ہاں! اس بات کا زبردست امکان ہے۔“ شوکی نے اسے  
گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میرے بارے میں اس قدر ہولناک، خوفناک  
اور ہیبت ناک خیال قائم نہ کریں۔ ورنہ...“ اس نے دھمکی دینے  
والے انداز میں کہا۔

”ورنہ کیا؟“ اشفاق نے برا سا منہ بنایا۔

”ورنہ میں بے موت مر جاؤں گا۔“

”بے موت آج تک کوئی بھی نہیں مر سکا۔“ بیگم جمید مسکرائیں۔

## اب ہوگی دعوت

رجسٹر پر لکھا تھا:

خوفناک شکل والے آدمی نے پہلے ان کی دیوار پر کوئی  
چھوٹی سی چیز چپکائی تھی، پھر وہ پائیں باغ میں گیا تھا۔ جب  
کر لڑکی وہیں کھڑی رہی تھی۔ گویا اس نے باغ میں بھی  
کچھ کیا تھا۔ اس کے بعد دروازے پر آ کر اس نے دستک  
دی تھی۔“

انھوں نے نوجوان کی طرف دیکھا:

”یار ٹی ایس ایم۔ اگر آپ دشمن ملک کے ایجنٹ نہیں  
ہیں۔ یا کوئی جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ یا کسی جرائم پیشہ کے  
ایجنٹ کے طور پر کام نہیں کر رہے تو ضرور کام کے آدمی ہیں۔“  
”شکریہ! ٹی ایس ایم مسکرا دیا۔“

اب وہ دروازے کی طرف دوڑے۔ دروازے کے باہر  
انھیں ایک بالکل ننھا سا سیاہ رنگ کا بٹن چپکا نظر آیا۔



میں خود کو ٹی ایس ایم ہی کہلاتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ  
پتہ نہیں تو پھر طاہر ایس ایم کہیں۔

چلے خیر۔ ہم اس نام سے گزارا کر لیں گے۔ یعنی  
طاہر سے۔ ورنہ ٹی ایس ایم سے پہلے تو یہ خیال آتا  
ہے کہ یہ کسی چائے کا نام ہے۔ یا چائے کی کپنی کا نام  
ہے۔ شوکی نے کہا۔

طاہر بڑے بڑے منہ بنانے لگا تھا۔ اس کے خاموش  
خیر خیر۔ آپ کے بارے میں فیصلہ تو انکل جمید کریں

گے۔ فی الحال آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو رہ سکتے  
ہیں۔ اور اگر آپ دُور بین گاہ جانا چاہیں تو آپ کی  
خوشی۔ ویسے آپ کا نام بہت عجیب ہے۔

میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر زیادہ خوش محسوس کر رہا ہوں؟ شوکی نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔  
ہاں! ساتھ رہ کر دُور بین سے دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اخلاق طنزیہ انداز میں بولا۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ انکل جمید ہی کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتا  
کریں گے۔

بالکل ٹھیک۔ لیکن ہمیں آپ سے ہوشیار تو رہنا پڑے گا۔ آفتاب نے بھٹا کر کہا۔

کیا پتا، آپ کیا کام دکھا جائیں۔ اشفاق نے منہ بنایا۔  
ضرور ہوشیار رہیں۔

بھاری دماغ مت چائیں۔ آفتاب نے بھٹا کر کہا۔

اور وہ نام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

میں جیرال کا آدمی ہرگز نہیں ہوں۔ میں تو اپنا آدمی  
خود ہوں۔

یہ کیا بات ہوئی۔ اپنا آدمی خود ہوں؟ شوکی جل گیا۔

مطلب یہ کہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا۔ اپنے۔ اپنے ملک کے لیے۔

اپنے دین اور اپنی قوم کے لیے کام کرتا ہوں اور کرنے کے لیے  
ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

خیر خیر۔ آپ کے بارے میں فیصلہ تو انکل جمید کریں

گے۔ فی الحال آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو رہ سکتے

ہیں۔ اور اگر آپ دُور بین گاہ جانا چاہیں تو آپ کی

خوشی۔ ویسے آپ کا نام بہت عجیب ہے۔

میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر زیادہ خوش محسوس کر رہا ہوں؟ شوکی نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

ہاں! ساتھ رہ کر دُور بین سے دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اخلاق طنزیہ انداز میں بولا۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ انکل جمید ہی کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتا

کریں گے۔

بالکل ٹھیک۔ لیکن ہمیں آپ سے ہوشیار تو رہنا پڑے گا۔ آفتاب نے بھٹا کر کہا۔

کیا پتا، آپ کیا کام دکھا جائیں۔ اشفاق نے منہ بنایا۔

ضرور ہوشیار رہیں۔

اور وہ نام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟





عجب موزل ہو۔ ابھی ابھی تو بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے۔ اشتاق بولا۔

باتیں کرنے میں اور لڑنے میں بہت فرق ہے۔

ادھر بیگم جمشید گرم پانی کا پائپ لیے ادھر کی طرف دوڑیں، پائپ پر پہنچتے ہی انھوں نے پائپ کا منہ کھول دیا۔ اور دھوا پانی دروازہ کھولنے والوں پر گرنے لگا، لیکن یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی کہ وہ اپنی جگہ پر پرسکون انداز میں بیٹھے ہیں۔

یہ تم گوشت پوست کے بنے ہوئے نہیں ہو کیا؟

ہمیں جیرال نے بھیجا ہے۔ اور وہ آپ لوگوں کی بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ لہذا جانتے تھے۔ اس پر آپ کیا کریں گے؟ چنانچہ انھوں نے ہمیں خاص بات کہیں کو یہاں آنے کی تاکید کی تھی۔

وہ اسی وقت نیچے کی طرف دوڑیں۔ اور دوسرا حربہ اختیار کرنے کے لیے باورچی خانے کا رخ کیا۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں۔

سے باپ رے۔ اتنی کلاشن کوفیں۔ طاہر نے تھر تھر

جانا مشکل ہوتا۔ جیرال کا جال جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے اور اس جال سے صرف ہم آپ کو بچا کر لے جاسکتے ہیں۔ لیکن اکرام بھی تو لے جاسکتے تھے۔

یہ آپ کا خیال ہے۔ ہمارا نہیں۔ لیکن آپ کا یہ خیال کیوں نہیں ہے؟ بیگم جمشید بولیں۔ آپ تو دیکھوں کی طرح بحث کرتی ہیں۔

مجبوری ہے۔ تو آپ دروازہ نہیں کھولیں گی؟ نہیں۔ وہ بولیں۔

ابھی بات ہے۔ کسی کو مدد کے لیے بلانا ہے تو بلا لیں۔ ہم دروازہ توڑ رہے ہیں۔

اس کام کے لیے میں خود کافی ہوں۔ انھوں نے منہ بتایا۔ بیگم جمشید فوراً واپس پلٹیں۔ ادھر دروازے پر کوئی چیز گھر گھر کرنے لگی۔

شاید وہ دروازے پر برما چلا رہے ہیں۔ شوکی نے گھبرا کر کہا۔

جتنی گھبرانے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم۔ میں کیا کروں۔ ارے ہاں۔ میں پائیں باغ کے ذریعے دوڑ لگا جاتا ہوں۔ طاہر بولا۔



”ہاں ! اس میں شک نہیں۔“

”دو۔ دیکھیے۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔“ طاہر نے باپ کو کہا۔

”غریب آدمی کار اور دو درہن کے مالک نہیں ہوتے۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔“

”ادہ ! یہ تو یہ بات بھی جانتے ہیں۔“ طاہر نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں ! لہذا اب خاموش رہیں۔ ان کے ساتھ جانا ہی ہو قبضے میں ہیں۔ اب تم لوگوں کی کمی وہاں شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔“

”یہ بات جس قدر خوشی کی ہے، اسی قدر ہولناک بھی تو شوکی نے فوراً کہا۔“

”ہاں ! یہ تو ہے۔“

”اور اچھی بات ہے۔ باہر گاڑی کھڑی ہے۔“

”چاپ اس میں بیٹھ جاؤ۔ اگر کوئی شرارت کرنے کی کوشش کرے، تو بڑی طرح پیش آئیں گے۔“

”نہیں۔ لیکن بخاب ! میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق نہ سہی، لیکن تم جاسوسی ضرور کر رہے تھے۔ یہاں ہونے والی ساری گفتگو مسٹر جیرال سن چکے ہیں۔ لہذا مسٹر جیرال سے ملاقات کر لیجیے۔ ایک نے طنزیہ انداز میں کہا۔“

”نہیں اندر لایا گیا۔ پرنسپل دودھ والے کمرے میں جونیس

کا نپتے ہوئے کہا۔

”خاموش۔ شوکی نے اسے ڈانٹا۔“

”اور وہ سہم گیا۔“

”کیا چاہتے ہو دو تلو؟“

”تم لوگوں کو تجربہ گاہ پہنچانا ہے۔ اس لیے کہ انپکٹر جمشید

ان کے اسٹنٹ بھی وہاں پہنچ چکے ہیں اور پوری طرح ہمارے

قبضے میں ہیں۔ اب تم لوگوں کی کمی وہاں شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔“

”ان حالات میں تو ہم خود خوشی سے وہاں جانا پسند کریں گے۔“

”یہ بات جس قدر خوشی کی ہے، اسی قدر ہولناک بھی تو شوکی نے فوراً کہا۔“

”یہ اور اچھی بات ہے۔ باہر گاڑی کھڑی ہے۔“

”چاپ اس میں بیٹھ جاؤ۔ اگر کوئی شرارت کرنے کی کوشش کرے، تو بڑی طرح پیش آئیں گے۔“

”نہیں۔ لیکن بخاب ! میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق نہ سہی، لیکن تم جاسوسی ضرور کر رہے تھے۔ یہاں ہونے والی ساری گفتگو مسٹر جیرال سن چکے ہیں۔ لہذا مسٹر جیرال سے ملاقات کر لیجیے۔ ایک نے طنزیہ انداز میں کہا۔“

”نہیں اندر لایا گیا۔ پرنسپل دودھ والے کمرے میں جونیس

کا نپتے ہوئے کہا۔

”خاموش۔ شوکی نے اسے ڈانٹا۔“

”اور وہ سہم گیا۔“

”کیا چاہتے ہو دو تلو؟“

”تم لوگوں کو تجربہ گاہ پہنچانا ہے۔ اس لیے کہ انپکٹر جمشید

وہ داخل ہوئے۔ ان کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے  
رہ گئے۔

## امید کی آخری کرنیں

”آپ کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا مطلب یہ ہے کہ  
میرا اندازہ بالکل درست ہے۔ تو اڈن طشتری میں اس بار  
کسی دوسرے سیارے کی مخلوق آئی تھی۔ اور انشارج اس  
خبر کو چھپانا چاہتا ہے؟“

”ہاں! یہی بات ہے۔“ پروفیسر ارسلان نے کھوٹے کھوٹے  
انداز میں کہا۔

”اور آپ نے اپنے آلات کے ذریعے اس مخلوق کو دیکھ  
لیا تھا۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”تو پھر۔“ آپ نے یہ خبر ہماری حکومت کو کیوں نہیں دی،  
اپنے ملک کیوں دکھی۔ کیا صرف اس لیے کہ ایم برٹن سے  
آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں اور اس نے آپ کو کوئی بہت  
بڑا لاپرواہ دیا تھا۔ یہ کہ اگر آپ یہ خبر چھپائے دیں گے

انسپکٹر جمشید، اکرام اور باقی لوگ کرسیوں پر رسیوں  
ذریعے بندھے ہوئے تھے۔ جب کہ ایک شخص ان کی  
آرام کرسی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ان کی طرف دیکھ کر  
اس نے کہا:

”خوش آمدید۔ آپ کا ہی انتظار تھا۔ اب  
دعوت! اس نے مسکرا کر کہا۔  
عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔“



تو انشارجہ کی طرف سے ایک بہت بڑی رقم آپ کو ملے گی۔  
میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟

”نہیں۔“ اس نے منہ سے نکلا۔

”بہت خوب! مخلوق کون سے میارے کی ہے؟“

”سیارے کا نام چلی پائی ہے۔“

”جلی بانی - اچھا - پہلے یہ نام سننے میں نہیں آیا۔“

”مخلوق نے یہی نام بتایا تھا۔“

”بہت خوب! تو وہ نام بتانے کے قابل تھا؟“

”نہیں۔ اے اس قابل بنایا گیا تھا۔“

”تو کیا۔۔۔ وہی مخلوق اس دقت ہمارے ملک میں جبرال کی

صورت میں موجود ہے؟ انکسٹر کامران مرزا نے پریشان

”ہاں! آپ نے سو فیصد درست نتیجہ نکال لیا۔“

”لیکن یہ نتیجہ آپ کے لئے مدد دے گا۔“

۱۱- ہوا کا

لیکن آپ کو یہ فرصت نہیں ملے گی۔ مسٹر جیرال یہاں پہنچ

”آپ، ہمارے ملک کے مجرم ہیں۔ ہم آپ کو فرار نہیں

”مجھے یہاں سے انشاء ہے یا کسی اور ملک میں پہنچانا۔ مرے

سیرال کا کام ہے۔۔۔ یہ کام اچھی کو کرنا ہے، لہذا میں اس

اے میں کیوں سوچوں کہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں گا

نہیں۔



”بلکہ مسٹر انسپکٹر کامران مرزا اگر میں ایک اور خبر آپ کو مرزا  
دوں تو مارے حیرت کے آپ لوگوں کا بُرا حال ہو گا۔“

”ہمارا دعویٰ ہے کہ بُرا حال نہیں ہو گا۔ چاہے آپ کسی  
حیرت انگیز خبر کیوں نہ سنا دیں۔“

”بھئی دیکھ لیں۔ میں جو خبر سنا سکتا ہوں۔ اس کے  
دنیا کے صرف چند آدمی واقف ہیں۔“

”اس کے باوجود ہم حیران نہیں ہوں گے۔ آپ تجربہ کار  
لیں؟ انھوں نے کہا۔“

”خیر میں ابھی خبر سنا دیتا ہوں۔ ہاتھ کنگن کو آدھی کیا  
مسٹر جیرال۔ جو دوسرے سیارے سے آئے ہیں۔ انھوں نے

بتایا ہے کہ اس سیارے کی آبادی میں۔ نہ صرف یہ کہ وہ  
موجود تھا۔ بلکہ وہاں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، خزانہ

انسپکٹر کامران مرزا، آفتاب، آصف، فرحت اور شوکی برادر  
سب لوگ موجود ہیں۔“

”نہیں!!! وہ واقعی دھک سے رہ گئے۔ یہ بات انھوں نے  
کبھی اپنے وہم و گمان میں بھی نہیں سوچی تھی۔ چند سیکنڈ

ان پر سکتے کا عالم طاری رہا۔ ایسے میں پروفیسر ارسلان  
نے کہا:

”کیا خیال ہے۔ آپ لوگ چہرہ زندہ ہوئے یا نہیں؟“

”ہاں! آپ جیت گئے: انسپکٹر کامران مرزا بولے۔  
تب تو ہم پھر اس سیارے کی سیر کو ضرور جائیں گے۔“  
آفتاب نے زور دار لہجے میں کہا۔

”کیا۔ بھئی واہ۔ بہت خوب صورت آئیڈیا ہے۔“  
لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے جائیں گے۔ جیرال تک تو  
وہاں جانے کے قابل رہا نہیں۔“

”دیکھا جائے گا۔ جانے کے قابل ہوں گے تبھی جائیں گے نا۔“  
”ہاں اور کیا۔ ویسے بات ہے بہت زور دار۔ اور میں سوچ

رہا ہوں۔ اگر کبھی ہم وہاں پہنچ گئے اور ایک دوسرے کے  
سامنے آ گئے تو کس قدر عجیب لگے گا۔“

”خیر۔ اللہ کو منظور ہوا تو ہم وہاں ایک دن ضرور جائیں  
گے۔ اب ہم آپ کو گرفتار کر رہے ہیں، کیونکہ ہم جلد

از جلد انسپکٹر جمشید تک پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ میں بہت بڑا  
خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔“

”آپ لوگوں کو محسوس کرنا بھی چاہیے، لیکن مشکل یہ ہے  
کہ مسٹر جیرال تو اصل منصوبے کی ہوا تک نہیں لگنے دیں

۔ آپ کر کیا لیں گے۔“ ہم وہ کر لیں گے جو ہمارے اللہ کو منظور ہو گا اور میں  
اس سے زیادہ تو ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔“

اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ انپکٹر کامران مرزا نے فوراً  
آئی جی شیخ نثار احمد سے رابطہ کیا اور پھر وہاں فوراً پولیس  
کے اہم لوگ پہنچ گئے، کیونکہ یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ  
نہیں تھا۔ خود آئی جی صاحب بھاگے چلے آئے تھے۔ انہیں  
تمام باتیں تفصیل سے بتائی گئیں تو ان کی سٹی بھی گم ہو گئی۔  
شیخ صاحب چلا اٹھے :

”لیکن انپکٹر جمشید کہاں ہیں؟“

”وہ جہاں بھی ہیں۔ ہم ان تک پہنچ جائیں گے اور پھر  
کر جیرال کے منصوبے کا خاتمہ کریں گے ان شاء اللہ۔“  
”مجھے آپ لوگوں سے یہی امید ہے۔ بلکہ آپ تو ہمارے  
ملک کی اُمید کی آخری کرنیں ہیں۔“  
”آخری کرنیں؟“ آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

”کیوں۔ کیا ہوا بھئی۔ کیا تم لوگ آخری کرنیں نہیں ہو  
سکتے۔ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”یہ تو خیر بعد کی بات ہے کہ ہم آخری کرنیں ہو سکتے ہیں۔  
یہ نہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔  
”حد ہو گئی۔ تم فاروق ہو کیا؟“ فرحت نے جھلا کر کہا۔

”ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔  
انپکٹر کامران مرزا نے سرد آواز میں کہا اور جلدی سے شیخ

صاحب سے بولے :

”ہمیں تو آپ اجازت دیں۔ مارے خوف کے میرا بُرا  
حال ہے۔“ پرو فیسر ارسلان فرار نہ ہونے پائیں۔

”کیا فرمایا آپ نے۔ مارے خوف کے۔ آپ اور خوفزدہ۔  
یکے ہو سکتا ہے۔“ آفتاب بولا۔

”یعنی ہم نہیں جانتے۔ منصوبہ کیا ہے۔ جب کہ جیرال پوری  
طرح حرکت میں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جلدی کیجیے۔“ آصف نے فوراً کہا۔  
اور پھر وہ وہاں سے سیدھے انپکٹر جمشید کے گھر کی طرف  
روانہ ہوئے۔ دروازے پر پہنچ کر انہیں ایک دھککا سا لگا،  
کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ اور انپکٹر جمشید کے دروازے کا  
کھلا ملنا خیریت کے نہ ہونے کی کھلی نشانی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے، اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ جیرال یہاں  
میں وارد کر گیا ہے۔“ انہوں نے اندر داخل ہونے سے پہلے کہا۔  
تب پھر اندر داخل ہونے سے پہلے بہت احتیاط کرنا ہو  
گا۔ فرحت بولی۔

اس طرح وقت ضائع ہو گا۔ انپکٹر کامران مرزا نے کہا اور  
دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ ایک نظر دیکھ کر ہی وہ پکار



”خان رحمان — انپکٹر جمشید کی کیا خبر ہے۔ اور ان کے بوی بچوں کی؟“

”اخوا کر لیے گئے۔“

”مم — میں نہیں جانتا — میں تو ڈنڈ...“

”ہاں! میں جانتا ہوں — خیر — فوراً تیار ہو جاؤ۔ اور میرے دوبارہ فون کا انتظار کرو۔“

انپکٹر کامران مرزا نے فون بند کر دیا۔ اب انھوں نے پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ریسپونڈ کیا گیا:

”السلام علیکم — پروفیسر داؤد بات کر رہا ہوں۔“

”علیکم السلام — انپکٹر کامران مرزا بات کر رہا ہوں۔“

”باقی سب لوگ بھی یہیں ہیں۔“

”بند کر دیا اور پھر بولے:

”آف مالک — اب کیا کریں؟“

”کیا ہوا آبا جان؟ آفتاب بولا۔“

پروفیسر داؤد نہیں — جیرال بات کر رہا تھا۔ گویا تجربہ گاہ

اس کا قبضہ ہے۔“

داؤد ایک ساتھ چلائے۔

”آپ کا مطلب ہے — انکل جمشید بھی“ آصف کے لیے میں حیرت تھی۔

”یہ میں نہیں جانتا کہ کون کون اخوا ہوا ہے۔ ایک منٹ پہلے یہ کڑکڑانے والے خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ظہور کی آواز سنائی دی:

”میں ظہور احمد ہوں درجہ اول۔“

”کیا مطلب — یہ درجہ اول کیا ہوا؟“

”جیسے میجسٹریٹ یا جج صاحبان نہیں ہوتے درجہ اول — میں

یہاں کا ملازم ہوں درجہ اول۔ ارے! یہ آواز تو کامران مرزا کی ہے۔ حد ہو گئی۔ پتھر پڑ گئے میرے کانوں پر شاید۔“

”وقت بہت نازک ہے۔ خان صاحب کہاں ہیں؟“

”صبح سے ڈنڈ پیل رہے ہیں — اپنے جسم کو فولاد سے

زیادہ مضبوط بنانے کے چکر میں ہیں آج کل۔“

”میری ان سے بات کراؤ۔ ذرا جلدی۔“

”جی اچھا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔“

جلد ہی خان رحمان کی آواز سنائی دی:

”السلام علیکم! آواز لاپ نہی تھی۔“



انپکٹر جمشید کے گھر پہنچ کر پہلے میں نے تھیں فون کیا، پھر  
تجربہ گاہ فون کیا۔ جانتے ہو۔ وہاں فون پر کس نے مجھ  
سے بات کی؟

کس نے؟ خان رحمان نے فوراً کہا۔

خود حیرال نے پروفیسر داؤد کی آواز میں بات کی تھی۔  
کیا!!! خان رحمان چلائے۔

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔ ارے ہاں۔ خان رحمان  
وہ بولے اور ایک بار پھر انہوں نے ان کے گھر ملائے:

"خان رحمان غور سے سنو، ہم بہت سنگین حالات سے  
ہیں۔ فوراً تجربہ گاہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ ادھر ہم  
ہو رہے ہیں۔"

"کہاں سے۔ ملک کے مشرقی حصے سے؟"

"ارے نہیں۔ میں اس وقت انپکٹر جمشید کے گھر سے  
کر رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔"

"اور جب تک ہم رقم کے وہاں نہ مل لیں۔ تم تجربہ گاہ کے  
انداز کا عمل نہ کرنا۔"

انہوں نے فوراً ریسپورڈ رکھ دیا اور تیزی سے باہر نکلے۔

اب ان کی کار ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ عین اس وقت  
تجربہ گاہ کے سامنے پہنچے، جب کہ خان رحمان پہنچے:

"یہ اچھا رہا۔ نہ ہمیں ان کا انتظار کرنا پڑا، نہ انہیں ملنا۔"

پہلے وہ ایک دوسرے سے ملے۔ پھر خان رحمان نے پھر

جمشید اور پروفیسر داؤد سے اپنی آخری ملاقات کے بارے

میں بتایا۔ اس کے بعد انپکٹر کامران مرزا نے بھی جلدی جلدی

مختصر طور پر انہیں حالات بتائے، پھر وہ بولے:

## اللہ کو یاد کرو

"آپ جانتے ہیں انیکٹر جمیڈ۔ یہ فون کس کا ہے؟"  
 "ہاں جانتا ہوں۔ انیکٹر کامران مرزا کا۔" وہ مسکرایا۔  
 "بہت خوب۔" مان گیا آپ کو بھی۔ لیکن میں یہ فون یہاں  
 نہیں سُنوں گا۔"

یہ کہ کر وہ اٹھا اور بیڈ کے سر کیس ڈور چلا گیا۔ پھر  
 واپس پلٹا تو اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ ناچ  
 رہی تھی۔

"وہ واقعی انیکٹر کامران مرزا تھے۔ آپ لوگوں کے لیے  
 بہت پریشان۔ میں نے پروفیسر داؤد بن کر ان سے بات  
 کی ہے۔ لہذا وہ بھی آ رہے ہیں۔"  
 "نہیں۔ نہیں۔" اکرام نے بوکھلا کر کہا۔

انیکٹر جمیڈ کے چہرے کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔  
 نرال کی نظر ان کے چہرے پر پڑی تو وہ زور سے چونکا،

پھر تیزی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

"ان حضرت کو کیا ہوا؟"

"شاید اس نے میری مسکراہٹ کا مطلب سمجھ لیا ہے۔"

"جی کیا فرمایا۔ مسکراہٹ کا مطلب؟" فاروق نے حیران  
 ہو کر کہا۔

"ہاں! جب اس نے بتایا۔ کہ اس نے پروفیسر داؤد کی  
 آواز میں انیکٹر کامران مرزا سے بات کی ہے تو میں بھرپور  
 انداز میں مسکرا دیا۔ ادھر اس نے مجھے مسکراتے دیکھ لیا اور  
 وہ میری مسکراہٹ کا مطلب جان گیا۔ کاش۔ میں نہ  
 مسکرایا ہوتا۔"

"لیکن آپ کے مسکرانے سے وہ کیا مطلب سمجھ گیا؟"  
 "یہ کہ انیکٹر کامران مرزا اس کی آواز کو پروفیسر داؤد کی  
 آواز ہرگز خیال نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی بھول ہے۔"

"اوہ۔ پھر اب وہ کیا کرے گا؟"

"انیکٹر کامران مرزا کے لیے نیا جال تیار کرے گا۔"

"حیرت تو اس پر ہے۔ کہ یہ حیرال آکمان سے گیا۔"

وہ زندہ کیسے ہو گیا؟

"اس سوال کا جواب انیکٹر کامران مرزا دیں گے۔ ان کا

ہمارے گھر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات کی تہ



جمشید نے صرٹ اتنا کہا تھا۔ ان کی تعریف۔ یعنی یہ کون ہیں۔ اسے اس درجے خوش دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ آپ پر جناب۔ خوش ہونے کے دوسرے تو نہیں پڑتے؟ غارتی بولا۔

”نن۔ نن۔ نن۔“ وہ ہلکایا۔

”یعنی تین نن۔ مگر تین کیا۔ آپ سات بار بھی نن بول دیں گے۔ تب بھی بات واضح نہیں ہوگی۔“ محمود نے برا سامنے بنایا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔ شوکی کو بات کرنے دو۔“ انپکٹر جمشید نے انہیں گھورا۔

شوکی نے اس کے بارے میں بتایا۔ انپکٹر جمشید چند ایکٹس لکھ کر اسے گھورتے رہے، آخر انہوں نے کہا:

”انجمن میں ڈال دیا ہے نوجوان۔ یا تو پکے چار سو بیس ہو۔ یا پھر پکے مجاہد ہو۔“

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Shabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

”چ۔ چار سو بیس۔ ارے باپ رے۔“ انہوں نے گھبراہٹ سے کہا۔ ”م۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ خود میرے بارے میں اندازہ لگائیں۔ اس لیے کہ آپ اندازے قائم کرنے میں بہت تیز ہیں۔“

”مک پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ وہ ہمارے گھر کا دُخ نہ کرتے۔“ عین اس وقت کمرے میں ایک تیز ترین گیس کی بو

محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اس گیس کو سانس کے ساتھ اندر نہ جانے دیں، جب تک ممکن ہوا، وہ سانس روکے رہے، لیکن آخر کار انہیں سانس لینا پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

ہوش آیا تو وہ تجربہ گاہ کے تہ خانے میں تھے۔ اب شوکی برادری بھی رسیوں سے بندھے نظر آئے۔ یہ تہ خانہ پروفیسر دادو نے خاص مقاصد کے لیے بنوایا تھا۔ اپنے خفیہ قسم کے تجربے وہ یہاں کرتے تھے، اس لیے یہاں ہر چیز کا انتظام تھا۔ ان سب کو کرسیوں پر بٹھا کر باندھا گیا تھا۔ تہ خانہ خوب روشن تھا، لیکن اس کی روشنی اور آواز اوپر تجربہ گاہ میں نہیں جاسکتی تھی۔ اب انہیں اطمینان اور سکون سے ایک دوسرے کا جائزہ لینے کا موقع ملا:

”یہ تم لوگوں کے ساتھ کون صاحب ہیں؟ ایسے میں انپکٹر جمشید کی نظریں ٹی ایم ایم پر پڑیں تو وہ پوچھ بیٹھے۔

”یہ ٹی ایم ایم ہیں۔ آپ انہیں طاہر ایس ایم کہہ سکتے ہیں۔“ عجیب سا نام ہے۔ خیر۔ ان کی تعریف؟

طاہر خوش ہو گیا۔ پھول کر کپا ہو گیا۔ حالانکہ ابھی انپکٹر



"میں اندازہ لگا لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ ارے ہاں۔ فون نمبر کیا ہے تمہارا؟"

"جی۔ فون نمبر۔ فون نمبر پانچ چار سو بیس ہے۔"

"واہ۔ کیا نمبر مارا ہے۔ پانچ چار سو بیس۔ اب اس میں کیا شک رہ گیا کہ آپ جناب چار سو بیس ہیں، بلکہ پانچ گنا چار سو بیس ہیں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"میں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس نے بھٹا کر کہا۔

"ہائیں! تو کیا تم گونگے ہو؟" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں انپکٹر کامران مرزا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا تم لوگ اندازہ لگا سکتے ہو۔ وہ اب کیا کریں گے۔ تجربہ گاہ تک تو وہ کب کے پہنچ چکے ہوں گے اور اندر خطرے کو بھی وہ بھانپ چکے ہیں۔"

"تب وہ خاموشی سے اندر داخل ہوں گے جیسے آپ داخل ہوئے، لیکن جیرال کے جال میں پھنس جائیں گے۔"

"مشرقی ایس ایم۔ آپ بتا سکتے ہیں۔ ہمارے انکل

کیا کریں گے؟"

"ہاں! کیوں نہیں؟ اس نے اکر کر کہا۔

"بہت خوب۔ بتاؤ بھئی۔" انپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ اندر داخل ہی نہیں ہوں گے۔ باہر رہ کر تیل دیکھیں

گے، تیل کی دھار دیکھیں گے۔"

"ارے۔ ہماری نقل نہ مارو۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"لیکن یہ محاورہ تو میں نے میٹرک کی اردو گرامر کی

کتاب میں پڑھا تھا کبھی۔ یہ نقل مارنا کیسے ہو گیا۔" طاہر نے جلدی سے کہا۔

"جواب معقول ہے۔" محمود مسکرایا۔

"میرا خیال ہے۔" انپکٹر کامران مرزا باہر رہ کر صبر نہیں کر

سکتے۔ وہ اندر ضرور آئیں گے۔"

"اور اندر جیرال کا جال تیار ہے، کیونکہ ہمیں تہ خانے

میں بند کرنے کا مقصد ہی یہی ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کر سکتی ہوں۔" رفعت

کی آواز سنائی دی۔

"ضرور کیوں نہیں۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ تم بھی یہاں

موجود ہو۔" شکر ہے۔ یاد تو آیا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"یاد آیا نہیں۔ میں نے یاد دلایا ہے کہ میں بھی یہاں

موجود ہوں۔" رفعت نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اوہ ہاں! یہ بات بھی ہے۔ خیر تم بتاؤ۔ انکل کیا کریں

گے فرزانہ نے کہا۔

"لیکن فرزانہ۔ آج تمہاری عقل کو کیا ہوا؟"

رفت مکرانی۔

”سوار بنا لو، لیکن ایسے بھائی کام نہیں آئیں گے۔“

”دیکھیے۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ اور میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اچھا تو نہ کرو۔ کیا کر لو گے تم؟“

”نی الجال صبر۔ کیونکہ ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔“

”ارے ہاں۔ یاد آیا۔ آبا جان۔ آخر ہم ان دیوں سے

بہت حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔“ محمود چونکا۔

”اس لیے کہ یہ کوشش میں بہت پہلے کر چکا ہوں۔“

”جی کیا مطلب؟“

”یہ دیاں ہاتھ پیر ہلانے سے اور کتنی ہیں، لہذا تم ایسی

کوئی کوشش نہ کرنا۔ میں انتہائی تکلیف میں ہوں۔ کیونکہ اس

کوشش کے نتیجے میں دیاں میرے گوشت میں دھنس گئی ہیں۔“

”اور پھر بھی آپ ہنس رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں، باتیں کر

رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا تو نہیں۔“ فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

”اس لیے کہ تم پریشان نہ ہو جاؤ۔ اور یہ بتا کر میں نے

میں پریشان تو پھر بھی کر دیا۔ لیکن تم لوگوں کو خبردار کرنا

میرا فرض تھا۔“

”لیکن آبا جان! ہم ان گریسوں کو دیوار پر مار کر توڑ تو

”کچھ بھی نہیں۔ میں تو جانتی ہوں۔ انکل کیا کریں گے۔“

”ارے۔ تم جانتی ہو۔ تم اب تک منہ میں کیا گھنٹیاں

ڈالے بیٹھی تھیں۔“ محمود نے جل کر کہا۔

”یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا۔ پہلے سب اپنی

اپنی دانے دے لیں۔ پھر میں بات کروں گی۔“

پہلے رفعت۔

”اچھی بات ہے۔“ فونہی سہی۔ رفعت نے بُرا مان کر کہا۔

”اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں۔“ فرزانہ فوراً بولی۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ جس میں برا ماننے کی بات ہو

بتا دینا۔ مان جاؤں گی۔“ رفعت بولی۔

”اوہو! ہمارے کان کاٹنے کی تیاری ہو رہی ہے۔“

”ظاہر بھائی۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان میں

کسی کے کان تو نہیں کاٹے؟“

”نہیں۔ تو۔ بب باطل نہیں کاٹے۔ میں چشم و

گواہ ہوں۔“

”کیا کہا۔ ظاہر بھائی۔ ایک دم بھائی بھی بنا لیا۔“

شخص کو جس کے بارے میں ابھی تک آبا جان تک کوئی فیصلہ

نہیں کر سکے۔“

”تو فیصلہ ہونے تک بھائی بنا لینے میں کیا حرج ہے۔“



سکتے ہیں۔

”گھبراہٹ اور آپ کو۔ اگر آپ کو گھبراہٹ ہو رہی ہے تو پھر ہم تو مارے گئے۔ ہمیں تو نہ جانے کیا کیا کچھ ہونا چاہیے۔“

”لیکن گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ اشفاق کی آواز سنائی دی۔  
”ہاں بالکل۔ ہمیں اللہ کو یاد کرنا چاہیے۔“

”وہ خاموش ہو گئے۔ ان کی زبانیں ذکر کرنے میں جبرال نے رہنے ہی نہیں دیا ہوگا۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم چاقو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ تیسری بات یہ کہ شاید وہ چاقو ان رسیوں کا بال بھی بیکار نہ کر سکے۔“

”یہی۔ اب رسیوں کے بھی بال نکلنے لگے۔ کمال کر دیا۔“

آفتاب مسکرایا۔

”ان حالات میں اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”حیرت ہے۔ اب تک کوئی کارروائی شروع نہیں ہوئی۔“

آخر یہ انپیکٹر کامران مرزا کو کیا رہے ہیں۔

”سوال یہ ہے انکل۔ اگر انکل کامران مرزا بھی ہمارے پاس

پھنس گئے تو کیا ہوگا۔ جبرال تو اپنے منصوبے پر عمل

ہو چکا ہوگا۔ شوکی نے کہا۔

”عمل پیرا تو وہ پہلے سے ہو چکا ہے۔ مجھے تو شدید گھبراہٹ

ہی ہے۔“ انپیکٹر حمید بولے۔

”گھبراہٹ اور آپ کو۔ اگر آپ کو گھبراہٹ ہو رہی ہے تو پھر ہم تو مارے گئے۔ ہمیں تو نہ جانے کیا کیا کچھ ہونا چاہیے۔“

”لیکن گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ اشفاق کی آواز سنائی دی۔  
”ہاں بالکل۔ ہمیں اللہ کو یاد کرنا چاہیے۔“

”وہ خاموش ہو گئے۔ ان کی زبانیں ذکر کرنے میں جبرال نے رہنے ہی نہیں دیا ہوگا۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم چاقو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ تیسری بات یہ کہ شاید وہ چاقو ان رسیوں کا بال بھی بیکار نہ کر سکے۔“

”یہی۔ اب رسیوں کے بھی بال نکلنے لگے۔ کمال کر دیا۔“

آفتاب مسکرایا۔

”ان حالات میں اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”حیرت ہے۔ اب تک کوئی کارروائی شروع نہیں ہوئی۔“

آخر یہ انپیکٹر کامران مرزا کو کیا رہے ہیں۔

”سوال یہ ہے انکل۔ اگر انکل کامران مرزا بھی ہمارے پاس

پھنس گئے تو کیا ہوگا۔ جبرال تو اپنے منصوبے پر عمل

ہو چکا ہوگا۔ شوکی نے کہا۔

”عمل پیرا تو وہ پہلے سے ہو چکا ہے۔ مجھے تو شدید گھبراہٹ

ہی ہے۔“ انپیکٹر حمید بولے۔



”اے! وہ ایسے کہ میں اور انکل خان رحمان دروازے پر  
ٹپکی دیں گے۔ آپ پچھلی طرف سے اندر داخل ہونے کی  
کوشش کریں۔“

”بہت خوب! ان حالات میں اس سے بہتر ترکیب کوئی  
ہی ہو سکتی۔“ خان رحمان بولے۔

”خیر۔ ہم یہی کر لیتے ہیں۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا،  
اس میں جانا ہوں۔ جیرال بھی اس رخ سے سوچ چکا ہوگا۔“

”اے! بات جیرال نے کی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ  
ہمیں اس کے قابو میں ہیں۔ لہذا ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑنا پڑا۔“

”کہ ہم اب کیا کریں۔ اندر جیرال کا جال ہمارے لیے کچھ نہیں۔ بس یہی کریں گے۔ لیکن ذرا مجھے مزید غور  
تیار ہوگا۔ اور جیرال کا جال بہت خوفناک جال ہے۔ دو دوسرے یہ کہ ہمیں اسلحے سے بھی یس ہونا  
جال کا رخ تک کچھ میں نہیں آتا۔ پھر وہ جدید تر ہے۔“ وہ بولے۔

”چیزوں اور آلات سے کام لیتا ہے۔ اب جلدی ہے۔ آپ جیسے حکم فرمائیں۔ ہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”ہمیں خفیہ طور پر اندر داخل ہونا پڑے گا۔“

”یہ بات جیرال بھی جانتا ہے۔ کہ ہم خفیہ طور پر اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔“

”تب پھر ہم ڈبل کوشش کریں گے۔ ایسے میں فرحت بولی۔ انھوں نے وقت بھی طے کر لیا تھا کہ خان رحمان  
کیا کیا۔ ڈبل کوشش۔ وہ چونک اٹھے۔“

## خوفناک خطرہ

کس وقت دستک دیں گے۔ پچھلی طرف پہنچ کر انھوں نے دیکھا۔

وقت دیکھا، پھر سفیدے کے اس درخت کے نیچے پہنچے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی کرسیوں سے بندھے تہ خانے میں موجود جس کے ذریعے انپکٹر جمشید اندر پہنچے تھے۔ انھیں بھی پتہ نہ تھا۔ اور جیرال آرام کرسی میں بیٹھا ہلکے سے لے رہا تھا۔ درخت کا پتا تھا۔ لہذا پہلے وہ اس پر چڑھے۔ انھیں ہوش میں آتے دیکھ کر وہ ہنسنا:

دیوار پر اترے اور ریشم کی ڈوری کی مدد سے نیچے آ گئے۔ انپکٹر جمشید۔ تمہاری ساری ٹیم پوری ہو گئی۔ اب مجھ ان کے پیچھے آفتاب اور آصف بھی درخت پر چڑھ چکے تھے۔ کیونکہ یہ خبر سنا کر میں یہاں سے چل دوں گا۔ پھر دیوار پر آ گئے تھے۔ عین اس وقت فرحت صدر کم لوگ اگر خود کو ان رسیوں سے نجات دلا سکو۔ تو فوراً پر دستک دے رہی تھی۔ انھوں نے باغ کا جائزہ لیا تو ہوائی بال پہنچنے کی کوشش کرنا۔

اس میں کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے آفتاب اور آصف کو عوامی مال۔ کیا مطلب؟ انپکٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔

بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا، وہ دسی پر چھلٹے ان کے پاس پہنچ گئے۔ وہ انتظار کرنے لگے۔

ایمانک انھوں نے صدر دروازے کی طرف ایک ہلکے سے منائیں گے۔ آزادی کا جشن۔ میں نے ایک وزیر کے ذریعے دھماکے کی آواز سنی:

میرا خیال ہے۔ ان پر وار ہو گیا۔ انپکٹر کامران نے آزادی کا جشن منائیں گے اور پھر صبح ٹھیک چار بجے...

نے گھبرا کر کہا اور دوڑنے لگے۔ آفتاب اور آصف بھی وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ کے پیچھے دوڑے۔ چکر کاٹ کر انھیں صدر دروازہ ہو گیا۔ آنکھیں گویا جلنے لگیں۔ لہجہ اس قدر خوفناک تھا طرف آتا بڑا۔ فوراً ہی ایک اور دھماکا ہوا۔ یہ انپکٹر جمشید اور انپکٹر کامران مرزا تک کے روٹنے کھڑے پہلے کی نسبت بڑا تھا۔ انھیں اپنے پیروں کے نیچے ہونے لگی۔

زمین نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اور پھر انھیں کوئی پتا نہ چلا۔ انپکٹر جمشید کو خود اپنی آواز دور کسی اندھے



کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”ٹھیک چار بجے ہو گا۔ جس کے لیے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ پہلے میں نے اپنی تیاریاں مکمل کی تھیں، پھر میں آپ کے گھر آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا تھا۔ اگر میں ملاقات کے لیے نہ آتا اور پردے میں رہ کر اپنے منصوبے پر عمل کرتا تو شاید میں کامیاب نہ ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ پُر اسرار دعوت آپ لوگوں کو ضرور چونکا دیتی۔ لہذا میں نے اس کا انتظام کیا کہ لوگ چونک بھی نہ سکیں۔ اور جب میرے بتانے پر چلنے کے قابل ہوں تو کچھ کر نہ سکیں۔ اس جگہ سے عوامی ہال کا فاصلہ آدھ گھنٹے کا ہے۔ تیز ترین ڈرائیور بھی آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔ فون وٹاں کوئی سنے گا نہیں۔ کیونکہ وزیر صاحب نے یہ تجویز رکھی ہے کہ آج کے دن کوئی فون نہیں سنیں گے۔ یہ تجویز دراصل میری ہے۔ عوامی ہال کے فون اگر ایک ساتھ بھی بجنے لگیں، تب بھی ان کے کانوں پر جھجھکیں نہیں دینگے گی۔ دسیوں کے ہونے میں آپ لوگوں کو پورے چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ گویا پورے ساڑھے چار گھنٹے بعد جب آپ لوگ عوامی ہال تک پہنچنے کے قابل ہوں گے۔ تو عین اس لمحے دھماکا

گا۔ ایک ایسا دھماکا کہ آپ لوگوں کی رُو میں تک کانپ اٹھیں گی۔ آپ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا۔ کہ وہ دھماکا کیسا ہو گا۔ کس قسم کا ہو گا۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور جس وقت پہلا دھماکا ہو گا۔ اس وقت میرا جہاز انٹارجر کے لیے پرواز کر چکا ہو گا۔ میری سیٹ اس جہاز پر ایک ہے۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے۔ میں ایک آپ میں ہوں گا اور سپر ہومی میرے ساتھ ہو گی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ چلتے چلتے ایک آخری بات اور بتا دوں۔ یہ سارا چکر میں نے صرف اور صرف ایک رُومال کے ذریعے چلایا۔ صرف ایک رُومال سے آپ لوگوں کو شکست دے دی۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں۔ اب سے ٹھیک ساڑھے چار گھنٹے بعد دھماکا ہو گا۔ ساڑھے چار سے اگر ایک گھنٹا پہلے آپ لوگ عوامی ہال تک پہنچ جائیں۔ تو شاید کچھ کر سکیں۔ لیکن اُمید ہرگز نہیں ہے کیونکہ میں اپنا کام پکا کر چکا ہوں۔ کاش آپ لوگ سمجھ سکتے کہ آپ لوگوں کے اصل دشمن تو آپ کے اپنے ملک میں موجود ہیں۔ نہ آپ لوگ اپنے نبی کی باتوں پر غور کرتے ہیں۔ اور نہ اپنے نبی پر اسے ہوئے قرآن پر۔ قرآن بے شمار باتوں کا کھول کھول



کر اعلان کر رہا ہے، لیکن اس اعلان پر بھی آپ لوگ کان نہیں دھرتے۔ جاتے ہوئے بتا جاتا ہوں انکسپکٹر جنرل کہ قرآن کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے :

یہود اور نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہیں،

یہ تو آپس میں دوست ہیں۔

مطلب یہ کہ یہود ہوں۔ نصاریٰ ہوں۔ جابانی ہوں۔

یہ سب مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔ دشمن ہیں۔ اور تم

لوگ ہو کہ ان لوگوں کو اپنی فوج میں بھی شامل کر لیتے

ہو۔ بڑے بڑے سرکاری عہدے انھیں سونپ دیتے ہو۔

اپنے ایٹمی پلانٹ تک میں تم لوگوں نے جابانیوں کو عہدے

دے رکھے ہیں۔ پھر جھٹکا جیسا آدمی کیوں آسانی سے کام

نہیں ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے اس منصوبے پر عمل

کرنے میں دانتوں پسینہ آجاتا۔ لیکن میں نے تو بہت

آرام سے بیٹھے بیٹھے کامیابی حاصل کر لی۔ خطرہ تھا کہ

تم لوگوں سے۔ تمھیں اس دھماکے کے ذریعے یہاں کھینچ لیا

اب بس۔ اس سے زیادہ کیا کہوں۔ ویسے تم لوگ سوچ

رہے ہو گے کہ میں کیسا دشمن ہوں۔ خود ہی تم لوگوں کا

کمزوریوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔ یہ اس لیے کہ جب تم

اپنے ملک کو ان بلاؤں سے پاک کر لو گے اور پھر میں کوئی

اس قسم کا منصوبہ لے کر آؤں گا تو مجھے کام کر کے بہت  
مرا آئے گا۔ اس بار کی کامیابی تو نہت پھل پھسی رہی۔  
مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ بس ذہن کو گردش دیتا رہا اور  
کام ہوتا رہا۔

ایک منٹ اٹکل۔ آپ نے تو ہم سے کہا تھا کہ آپ ہمیں

آزاد کر دیں گے، اگر ہم ایک بڑی دعوت کا انتظام کر دیں،

میں میں تمام بڑے سرکاری آفسروں

کو۔ وہ۔ وہ۔ میں مذاق کے طور پر کہہ رہا تھا، ورنہ سارے

انتظامات تو میں پہلے کر چکا تھا۔

آف مالک۔ آخر وہ دھماکا کیا ہوگا مسٹر جیرال۔ کیا عوامی

ال اڑ جائے گا؟

یہ بات میں وقت سے پہلے نہیں بتاؤں گا؟

لیکن کیوں! ہم اب کچھ کر تو سیکھتے نہیں؟

میں اپنے منصوبے میں ایک فیصد خامی کا امکان ضرور

تھا ہوں۔ کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ میرا منصوبہ سو فی صد

ایجاب ہوگا۔ یہ میرا اصول ہے۔ اور دشمن کو وہ تمام

بتا دیتا ہوں۔ جو بتانے کے قابل ہوں۔ تاکہ وہ

اپنے ہاتھ پیر مار لے۔ اور اس کے دل میں کوئی

دشمن نہ رہ جائے۔ اب دیکھ لیں۔ تم لوگوں کے پاس

ایکٹر جمشید نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔  
 آپ ہمیں چند منٹ کی مہلت دیں! فرزانہ نے کہا اور  
 وہ تینوں سوچ میں ڈوب گئیں۔ صرف تین منٹ بعد  
 ہی فرزانہ بولی:

”ہمیں کسی ایک کرسی کی رسیوں کو آگ دکھانا ہوگی۔“

”آگ! آگ! آگ! وہ سب ایک ساتھ بولے۔“

”ہاں! آگ!“ فرزانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

لیکن ہم آگ کس طرح دکھائیں؟

فادوق کی جیب میں لائٹر موجود ہوتا ہے۔“

”اوہو۔ آخر لائٹر کیسے نکالیں۔ اور پھر اسے جلا لیں  
 کس طرح؟“

”پہلا مرحلہ لائٹر جیب سے نکالنے کا ہے۔ فادوق۔ تم

کبھی سمیت الٹ جاؤ۔“ فرزانہ نے سرد آواز میں کہا۔

”اور رسیاں جو میرے گوشت میں گھس جائیں گی۔“

”آپ لوگ ٹھہریں۔ میں اُٹا ہو جاتا ہوں۔“ ٹی ایس ایم

کی آواز سنائی دی۔

”عجیب احمق ہیں آپ بھی۔ ارے میاں لائٹر تو فادوق

کی جیب میں ہے۔“ محمود نے بھٹا کر کہا۔

”اوہ سوری! طاہر نے شرمایا کر کہا۔“

پورے ساڑھے چار گھنٹے ہیں۔ میں اگر یہ تمام باتیں نہ  
 اور تم لوگ اپنے آپ کو یہاں سے چھڑا لیتے تو کیا کرتے  
 کیا بھاگ دوڑ کرتے۔ اور ادھر دھماکا ہو جاتا۔ لیکن  
 نے سادی بات بتا دی ہے۔ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں  
 ٹاٹا۔“

یہ کہتے وقت اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رہی۔

وہ مڑا اور تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

میں سے کسی کا جی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

بہن کر وہ مڑا۔ ایک نظر ان سب پر ڈالی اور ہاتھ ہلا کر

بھٹل گیا۔ ساتھ ہی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

ان کے دل گویا دھک دھک کرنا بھول گئے۔

”ساڑھے چار گھنٹے بہت ہوتے ہیں آبا جان۔ سوچ کیا

ہیں۔ حرکت میں آجائیں! ایسے میں فادوق کی آواز گونج اٹھی۔

”اوہ ہاں واقعی۔ ساڑھے چار گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔“

لیکن ہمیں پہلے غور کرنا ہے کہ ان رسیوں سے نجات کس

طرح حاصل کریں۔ اس لیے کہ جتنا آپ لوگ کوشش کریں

گے۔ اتنا یہ رسیاں گوشت میں دھنسیں گی۔ سوال یہ

ہے کہ وہ کیا ترکیب ہو سکتی ہے کہ رسیاں گوشت میں

نہ دھنسیں؟ فرحت، فرزانہ۔ رفعت۔ آواز دواہی عقلموں کو

KLIP & STATIONERS  
 3902 JARVIS  
 3902 JARVIS  
 3902 JARVIS  
 3902 JARVIS



"لیکن بھی۔ اس نے اپنے جذبے کا اظہار تو کیا ہے  
انیکٹر جمید بولے۔

"م۔ میں الٹ رہا ہوں۔ چاہے ریاں میری ہڈیوں پر  
کیوں نہ پہنچ جائیں۔ فاروق نے جذباتی آواز میں کہا۔  
"شاباش فاروق۔ اس مہم کا سارا دار و مدار اب تو  
ہے۔" انیکٹر جمید بولے۔

"آپ پریشان نہ ہوں آبا جان۔  
یہ کہ کر فاروق نے زور لگایا تو کرسی اٹ گئی۔  
بھی قدم سے اٹا ہو گیا۔ اب وہ لگا اپنے جسم کو ہلانے  
تا کہ اس کی جیب سے چیزیں نکل کر گرنے لگ جائیں۔  
"شاباش فاروق۔ خود کو اور ہلاؤ۔" انیکٹر جمید بولے۔

"م۔ میں ہلا رہا ہوں۔ اور جوں جوں ہلا رہا ہوں۔  
رسیاں گوشت میں دھنس رہی ہیں۔  
"ہم جانتے ہیں فاروق۔ لیکن اپنے دین، ملک اور قوم  
کے لیے ایسی قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ کیا تم نہیں  
چاہتے کہ ہم حیرال کے منصوبے کو ناکام بنا دیں۔  
"بھلا میں کیوں نہ چاہوں گا۔"

"تو پھر ہلاؤ۔ خود کو۔ اس قدم ہلاؤ کہ جیب سے  
چیزیں گرنے لگیں۔"

فاروق زور زور سے خود کو ہلانے لگا۔ یہاں تک کہ  
باقی لوگوں نے اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون نکلنے  
دیکھ لیا۔ وہ کانپ گئے، لیکن مزہ سے کچھ نہ بولے۔  
آخر آدھ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد فاروق کی جیب سے  
پہلی چیز گری، لیکن وہ لائٹر نہیں، پنسل تراش تھا۔ ایسے میں  
انیکٹر کامران مرزا بولے :

"شاباش فاروق۔ ایک چیز باہر آ گری ہے۔ تو لائٹریکول  
نہیں گرے گا۔ اب جیب کا رخ بھی نیچے کی طرف ہے۔  
ایک دو جھٹکوں کی اور ضرورت ہے۔  
"ایک دو مزید جھٹکوں میں کہیں میرا جھٹکا نہ ہو جائے۔" فاروق  
نے گھبرائی ہون آواز میں کہا۔

"اپنے دین، ملک اور قوم کے لیے اگر تم جان قربان کر گئے  
تو ہم فخر کر سکیں گے فاروق۔ فکر نہ کرو۔" انیکٹر جمید نے بلند  
آواز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔ اللہ کا نام لے کر ایک اور زوردار جھٹکا  
مارتا ہوں۔" فاروق نے کہا اور زور سے جھٹکا دیا۔ اس بار  
تین چار چیزیں باہر آ کر گریں، لیکن ان میں لائٹر نہیں تھا۔  
فاروق نے ایک جھٹکا اور مارا۔ ساتھ ہی فرزانہ چلا اٹھی :  
"لائٹر باہر آ گرا ہے۔"



فرزاد کے ان الفاظ کے ساتھ ہی فاروق نے جسم ڈھیلا کر دیا۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار ظاہر تھے۔ انپیکٹر جمشید نے اس وقت اپنے دل میں درد سا محسوس کیا، لیکن انھوں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور لائٹر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اب سوال یہ ہے کہ اس لائٹر کو ہم جلائیں کس طرح فرحت بولی۔

”یہ کام میں اور انپیکٹر کامران مرزا کر سکتے ہیں۔ اور بس۔“ انپیکٹر جمشید نے کہا۔

”لیکن کیسے؟ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس تم دیکھتے جاؤ۔“

یہ کہہ کر انپیکٹر جمشید اپنی کرسی کو لائٹر کی طرف سرکانے لگے۔ لائٹر کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے کرسی کو الٹ دیا۔ اس طرح ان کا منہ فرش سے نزدیک ہو گیا۔ وہ اپنا منہ لائٹر کی طرف سرکانے لگے۔ یہاں تک کہ منہ لائٹر کو چھونے لگا۔ اب انھوں نے زبان اور ہونٹوں کی مدد سے لائٹر کو منہ میں لیا۔ انھوں نے لائٹر کا پچھلا حصہ منہ میں لیا تھا۔

”انپیکٹر کامران مرزا۔ اب آپ کو میرے نزدیک آنا پڑے گا۔ لائٹر آپ جلائیں گے۔“

”اتھ کے بغیر لائٹر کیسے جلایا جائے گا آبا جان؟“ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اللہ مالک ہے۔“ کوشش کرنا، ناکام کام ہے۔ اللہ چاہے گا تو لائٹر جل جائے گا۔“

ادھر انپیکٹر کامران مرزا ان کی طرف سرک رہے تھے۔ اب

اب کی نظریں ان پر جم گئیں۔ اللہ اللہ کر کے وہ ان تک پہنچ

گئے اور اپنی کرسی کو الٹ دیا۔ اب ان کا منہ ان کے

منہ کے نزدیک تھا۔ انھوں نے زبان باہر نکالی اور لائٹر کی پھر کی

دھک کر زور لگایا۔ گویا وہ زبان کے ذریعے پھر کی کو حرکت

دینا چاہتے تھے، لیکن زبان کے پورے زور کے باوجود پھر کی

سرکی۔ زبان آخر زبان ہے۔ بالکل نرم چیز۔ کئی بار

کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

”نہیں کام بن رہا۔“

تب پھر دوسرے رخ سے کوشش کریں۔ اپنے ہاتھ کو

اپنی ہاتھ سے ذرا سا باہر سرکانے کی کوشش کریں۔ اگر انگلی

ذرا سا سرے بھی باہر آگیا تو آپ اس سرے سے پھر کی

دھک دے سکیں گے۔“

ابھی بات ہے۔ میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔“

اب انھوں نے اپنے ہاتھ کو سرکانے کی کوشش شروع کر دی،

یہ کام بھی آسان نہیں تھا، لیکن انھیں کرنا تھا، وہ نندہ گھر  
رہے۔ لگاتے رہے۔ ان کی جان پر ہنسی رہی۔ آخر  
ہاتھ کو کسی قدر باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب  
کرسی کو سرکانے لگے۔ تاکہ ان کا ہاتھ لائٹر کے نزدیک  
جائے۔ اس کوشش میں بھی کئی منٹ لگے۔ آخر انگلی پھر  
رگڑ کھانے لگی۔ وہ بار بار اسے چکر دینے کی کوشش کر رہے  
اچانک لائٹر کا شعلہ بھڑکا۔

”وہ مارا۔ جلدی کریں۔ کرسی سے بندھی رسیوں کو  
دکھا دیں۔“ انپکٹر کامران مرزا چلائے۔

انپکٹر جمشید نے لائٹر کے شعلے کا رخ ان کی کرسی کے  
بندھی رسی کی طرف کر دیا، جونہی آگ نے اسے چھوا  
چرمر ہونے لگی۔ رسی نے تیزی سے آگ پکڑ لی۔ جونہی  
کرسی کے پاس سے جلی۔ انپکٹر کامران مرزا نے ایک  
مارا اور کرسی سے الگ ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ  
کو اپنے جسم سے الگ کر چکے تھے۔ اب انھوں نے  
اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رسیاں جلانے لگے۔ ایک  
کر کے وہ سب آزاد ہو گئے۔ اب وہ اوپر کی طرف  
ابھی تجربہ گاہ والے کمرے تک پہنچے تھے کہ فون کی گھنٹی  
لگتی۔

انپکٹر جمشید نے ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے جیرال  
کی آواز سنائی دی:

”بہت خوب انپکٹر جمشید۔ مان گیا آپ نوگوں کو۔ مجھے  
صرف ایک فی صد اُمید تھی کہ آپ لوگ وقت سے پہلے  
رسی نہیں کھول سکیں گے، لیکن میرا ننانوے فی صد اندازہ غلط  
ہو گیا اور ایک فی صد اُمید جیت گئی۔ اب عوامی ہال کی  
طرف دوڑ لگا دیں۔ میں بہت قریب سے دیکھوں گا کہ اب  
پ لوگ کیا کرتے ہیں۔“

وہ خان رحمان کی بڑی گاڑی میں دوڑ پڑے۔ ڈرائیونگ انپکٹر  
جمشید کو رہے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ عوامی ہال کے سامنے  
پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑی سرکاری عمارت تھی۔ تمام  
بڑی سرکاری دعوتیں اس ہال میں دی جاتی تھیں۔ اس وقت  
یہ عمارت جگ جگ مگ مگ کر رہی تھی۔ تمام بڑے سرکاری  
آفیسر اس میں موجود تھے اور جشن منا رہے تھے۔ کھا رہے  
پنی رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔  
اس بات سے بے خبر کہ کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

وہ صدر دروازے پر جونہی گاڑی سے اترے، دروازے  
پر موجود فوجی آفیسر نے اپنی رائفلیں ان پر تان دیں:  
”خبردار۔ وہیں رک جائیے، ورنہ ہم گولی مار دیں گے۔“



”خبردار! میں انپکٹر جمشید ہوں۔ اور ایک بہت بڑے خطرے  
کی خبر لے کر آیا ہوں۔ رانفیس نیچی کر لیں اور ہمیں اندر جانے  
دیں۔“

”افسوس! آپ اندر نہیں جا سکتے۔“

”کیا کہا۔ ہم اندر نہیں جا سکتے۔ تو پھر یہ پوری بات  
مطلبے کا ڈھیر بننے والی ہے۔ اب سے صرف تین گھنٹے  
”کیا مطلب؟“  
وہ ایک ساتھ چلائے۔

حکم یہ ہے

”ہاں! آپ لوگ ہمیں نہ روکیں۔ ہم پہلے ہی بہت مشکل  
سے جیل کی قید سے نکل کر آئے ہیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ کڑا انپکٹر  
جمشید نے پکڑا ہٹا کر اپنے زخم دکھائے۔ فاروق نے بھی یہی کیا۔  
اس کے زخم دیکھ کر تو فوجی بھی کانپ گئے۔ پھر ایک نے نرم  
آواز میں کہا:

”لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ حکم نہیں ہے۔“  
کیا آئی جی نثار احمد صاحب اندر ہیں؟  
”ہمیں معلوم نہیں۔“

صدر صاحب تو اندر موجود ہیں نا؟

”ہاں! ان کے بارے میں معلوم ہے۔ وہ اندر ہیں۔“

”ان سے کہ دیں۔ باہر میں موجود ہوں اور فوری طور پر ملنا  
چاہتا ہوں۔“

حکم یہ ہے کہ نہ تو کسی ملاقاتی کو اندر جانے دیا جائے،



کسی کا پیغام اندر پہنچایا جائے۔ نہ فون پر کسی کی کسی سے بات کرائی جائے۔

”آپ ایسے نہیں مانیں گے۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔“

یہ کہ کر انھوں نے اپنی اندرونی جیب سے اپنا اجازت نامہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ہمیں حکم ہے۔ کسی کی لائی ہوئی کوئی چیز نہ دیکھیں۔“

نہ اس پر توجہ دیں۔ یہاں تک کہ صدر صاحب کا حکم ان کے والد صاحب بھی آجائیں۔ تو انھیں بھی باہر روک دیا جائے۔ اور ان مکان کا پتہ اندر نہ دیا جائے۔

”اچھی بات ہے۔ اب ہم اپنی کوشش شروع کرتے ہیں۔“

ایک بات آپ سن لیں۔ یہ پوری کی پوری عمارت ڈال دی گئی۔

والی سے۔ جیرال نے اس عمارت میں ٹائم بم فٹ کر دی ہیں۔ ایک بھی فرد نہیں بچے گا۔ خود آپ لوگ بھی نہیں بچیں گے۔

کیا یہ پیغام بھی آپ اندر نہیں دے سکتے؟ ان کا

حد درجے سخت ہو گیا۔

”کیا واقعی یہ بات ہے؟“ فوجی نے پریشان ہو کر کہا۔

”جب دھماکے شروع ہوں گے، اس وقت آپ کو یقین ہو جائے گا، لیکن نہیں۔ آپ اس وقت یقین کرنے اور نہ کرنے کے قابل کہاں رہ جائیں گے۔“

”کیا واقعی یہ بات ہے؟“ فوجی نے پریشان ہو کر کہا۔

”جب دھماکے شروع ہوں گے، اس وقت آپ کو یقین ہو جائے گا، لیکن نہیں۔ آپ اس وقت یقین کرنے اور نہ کرنے کے قابل کہاں رہ جائیں گے۔“

”کیا واقعی یہ بات ہے؟“ فوجی نے پریشان ہو کر کہا۔

”جب دھماکے شروع ہوں گے، اس وقت آپ کو یقین ہو جائے گا، لیکن نہیں۔ آپ اس وقت یقین کرنے اور نہ کرنے کے قابل کہاں رہ جائیں گے۔“

”کیا واقعی یہ بات ہے؟“ فوجی نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں۔ میں اندر جاؤں گا۔ فوجی نے جلدی سے کہا۔

اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ آپ مجھے جانے دیں۔

”اچھی بات ہے۔ اب جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ آپ

لوگ اندر جائیں۔“

”شکریہ بہت بہت۔ یہ ہے بہادری کی بات۔“ انپکٹر جمشید

خوش ہو گئے۔

پھر وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر عجیب سا ماحول ہو رہا

تھا۔ دیکھتے لگا رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ چلا رہے

تھے۔ کچھ کھا رہے تھے، کچھ جھوم رہے تھے۔ کھا رہے تھے،

کھا رہے تھے۔ اتنے بڑے بڑے اور سنجیدہ قسم کے لوگوں

کو اس قسم کی حرکات کرتے دیکھ کر خود انھیں شرم محسوس

ہونے لگی۔ ایسے میں ان کی نظریں آئی بی صاحب کو تلاش

کر رہی تھیں، لیکن وہ انھیں ان لوگوں کے درمیان کہیں بھی

نظر نہیں آ رہے تھے۔

”بیرا خیال ہے۔ وہ کہیں الگ تھلک بیٹھے ہوں گے، اس

قسم کی محفل انھیں پسند نہیں ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”تو پھر ہم گھوم پھر کر دور دراز کے گوشوں میں انھیں تلاش

کرتے ہیں۔“ انپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر کاٹنے لگے۔ آخر ایک کونے

باہر نکالنے کی کوشش کریں۔

آؤ جمشید: صدر صاحب نے کہا۔

اور صدر صاحب مالک کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ پورے  
ہال میں ان کی آواز گونجنے لگی:

”خواتین و حضرات۔ آپ کے لیے انپیکٹر جمشید کی طرف سے  
ایک خبر۔ گھبرانے اور پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہو  
گا۔ آپ سب پرسکون انداز میں عمارت سے باہر آجائیں،  
انپیکٹر جمشید خبر آپ لوگوں کو باہر ہی سنائیں گے۔“

”کیا بات ہوئی سر۔ انپیکٹر جمشید خبر اندر کیوں نہیں  
سناسکتے؟ کسی آوازیں ابھریں۔“

”اس کی ایک وجہ ہے۔ اور وجہ بھی آپ کو باہر سنائی  
جاتے گی۔ اب آپ سب باہر تشریف لے چلیں۔ تمام  
خواتین کی توں چھوڑ دیں۔“

”اوکے سر۔ جو حکم۔“

سب لوگ پرسکون انداز میں باہر جانے لگے۔

”بہت اچھا رہا۔ اگر پہلے ہی بھوں کی خبر دے دی  
جاتی تو سب لوگ اندھا دھند باہر کی طرف دوڑ پڑتے۔  
اسی طرح بہت نقصان ہوتا، کچھ لوگ زخمی ہو جاتے۔  
بچے کر کر کئے جاتے۔“ انپیکٹر کامران مرزا نے صدر صاحب

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

میں چند آدمی گریلوں میں دھنسنے نظر آئے۔ وہ اس طرف  
بڑھنے لگے۔ نزدیک پہنچ کر انھوں نے دیکھا۔ وہاں نہ صرف  
آئی جی صاحب موجود تھے، بلکہ ان کے ساتھ ملک کے  
اور ایک دو دوسرے سنجیدہ لوگ، بھی تھے۔ انھیں دیکھ کر  
وہ بُری طرح چونکے:

”جمشید۔ تم اور کامران مرزا بھی۔ خیر تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے سر۔ بہت بڑا خطرہ ہمارے سر  
منڈلا رہا ہے۔ آپ سب کو یہ عمارت فوراً چھوڑ دینی چاہیے  
”لگ۔ کیا مطلب؟“ وہ بوکھلا اُٹھے۔

”اس عمارت میں جیرال نے ٹائم بم فٹ کر رکھے ہیں۔“

”لگ۔ کیا۔ ٹائم بم؟ وہ چلائے۔“

”ہاں سر۔ آپ لوگوں کو اس خطرے سے خبردار کرنے کے لیے  
ہمیں یہاں آنا تھا، لیکن ہم جیرال کی قید میں تھے۔ اس  
قید سے رہائی کے لیے یہ دیکھیں سر۔ ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا  
پڑا۔“ یہ کہہ کر انپیکٹر جمشید نے فاردق کے جسم سے کپڑا  
وہ تھرا اُٹھے۔ ساتھ ہی انپیکٹر جمشید اور انپیکٹر کامران مرزا  
نے بھی کپڑے رٹاکر زخم دکھائے:

”اُف مالک۔ یہ۔ یہ کیسے زخم ہیں؟“

”ان کی تفصیل بعد میں سر۔ پہلے آپ ان سب لوگوں کو  
بہت اچھا دیکھا۔“



کی تعریف کی۔

کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ بلاوجہ ہماری دعوت خراب کی گئی۔  
ایک تیز آواز سنائی دی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ فدیہ خاں  
باہر چلائی تھے۔

ہاں بلاوجہ اتنے لوگوں کو پریشان کیا گیا؟ ایک اور آئینہ بولا۔  
میں اس لمحے کیسے دور ایک دھماکا ہوا۔ ان سب  
کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے چونک کر عمارت  
کی طرف دیکھا، لیکن عوامی ہال بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑا  
تھا۔ اسی وقت کئی دھماکے پے درپے ہوئے اور پھر تو  
مسل دھماکوں کا سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ جب کہ عوامی ہال  
وہاں کا توں تھا۔

یہ دھماکے کیسے اور ہو رہے ہیں؟ انپکٹر جمشید پوری قوت  
سے چلائے۔

لیکن کہاں؟ انپکٹر کامران مرزا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

میں اسی لمحے کئی ہولناک دھماکے ہوئے۔ پورا شہر لرز  
اٹھا۔ پورے شہر میں ہل چل پٹ پٹ گئی۔ چند منٹ بعد انھیں  
یہ ہولناک ترین خبر سنا پڑی :

پورے ملک کے اسلحے کے ڈپو میں آگ لگ گئی ہے :

ان کے حواس جاتے رہے۔ پھر میزائل پھٹنے لگے۔  
میزائل ادھر سے ادھر شہر پر گرنے لگے۔ جب کہ اسلحے

چند منٹ میں عمارت خالی ہو گئی۔ وہ باہر آئے۔ انپکٹر  
جمشید ایک اونچی جگہ کھڑے ہو گئے۔ تفصیل سے ساری بات  
سمانے لگے۔ لوگوں کے منہ مارے خون کے کھلتے چلے گئے  
پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ بولے :

اور ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ آپ سب لوگوں کے لیے  
سامنے والی عمارت حاضر ہے۔ آپ اپنی باقی دعوت  
اڑالیں۔ اگرچہ وہاں اس قدر انتظامات نہیں کیے جاسکے  
ٹھیک چار بجے کا وقت ہے۔ اگر اس سے پہلے بم سکوڑے  
بم تلاش کر لیے تو ہم عمارت بچانے میں کامیاب ہو جائیں  
گے، ورنہ اللہ کو جو منظور ہے۔ وہ ہو کر رہے گا :

اور پھر وہ ساتھ والی عمارت میں داخل ہونے لگے۔ اس  
عمارت کو صدر صاحب کے حکم پر کھلویا گیا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتے لگا۔ یہاں تک کہ صبح کے چار  
بجئے میں چند منٹ رہ گئے۔ اس وقت تک بم سکوڑا مسلسل  
بم تلاش کرنے کی کوشش میں لگا رہا تھا۔ لیکن پوری عمارت  
میں انھیں ایک بم بھی نہ مل سکا۔ اور پھر چار بجئے میں تین  
چار منٹ پہلے انھیں بھی باہر نکال لیا گیا۔

پھر چار بج گئے۔ چار بج کر چند سیکنڈ ہو گئے :



کا ڈپو شہر سے باہر کافی فاصلے پر تھا۔ لیکن میزائل تو خود میلوں دور دار کرتے ہیں۔ جہاں جہاں میزائل گرے۔

تباہی مچنے لگی۔ عمارتیں تباہ ہونے لگیں۔ دارالحکومت۔ دارالحکومت کے ساتھ واقع دوسرے شہر۔ بھی زد میں آ گئے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب کے ہاتھوں کے

ٹوٹے اڑ چکے تھے۔ صدر کیا۔ وزیر کیا۔ انیکٹر جمشید کیا۔ سب کو قیامت ہی قیامت نظر آ رہی تھی۔

آف مالک۔ اگر سارا اسلحہ جل گیا۔ تمام میزائلوں کے آگ پکڑ لی تو کیا ہو گا؟ انیکٹر جمشید کانپ کر بولے۔

پورا ملک ان کی پیٹ میں آ جائے گا۔ پورے ملک کو تباہ کرنے کا ہولناک ترین۔ لہذا خیز ترین منصوبہ۔ حیرانی دار کر گیا اور ہم عوامی ہل پر نظریں جمائے رہے۔

آف۔ آف۔ آف۔ لیکن کیا آبا جان اس آگ پر قابو نہیں پایا جاسکتا؟

محمود بولا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ ان حالات میں اسلحے کے ڈپو

دُخ کون کر سکتا ہے۔ جو کمرے گا، مارا جائے گا۔

”ہم پردت۔ میزائل پردت لباس بھی ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں۔ ذرا غور کرو۔ صرف لباس کیسے بچا سکتا

ہے۔ اگر ایک شخص کے جسم پر ہم پردت لباس ہے۔ اور اس کے اوپر تباہ ہونے والی کوئی عمارت گر پڑے تو کیا کرے گا؟

تب پھر کیا، ہمارا سارا اسلحہ جل جائے گا۔ پورا ملک تباہ ہو جائے گا۔ دشمن کی فوج کے بغیر ہم ختم کر دیے جائیں گے۔“

اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ انیکٹر کامران مرزا نے

ڈرڑانے کے انداز میں کہا۔ پھر ہیلو پر اعلان ہونے لگا:

ایوان صدر میں صدر صاحب نے تمام بڑے فوجیوں کا اجلاس

کلیا ہے۔ فوجی حضرات فوراً وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔ اور

ان کے دُخ ایوان صدر کی طرف ہو گئے۔ انھیں فوراً

مال میں پہنچایا گیا۔ یہاں سب لوگ جمع تھے۔ انیکٹر جمشید

ان کے ساتھ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں انشارج

ایک پوری ٹیم بھی موجود تھی۔

ان حضرات کا یہاں کیا کام سر؟ انیکٹر جمشید نے سرد

از میں کہا۔

”ابھی ابھی انشارج سے یہاں پہنچے ہیں۔ اسلحے میں آگ

لگ جانے کے سلسلے میں ہی یہاں آئے ہیں، تاکہ ہمیں کوئی پر مشورہ دے سکیں۔

”ادہ اچھا۔ ہم ان کا مشورہ ضرور سنیں گے۔“

”پہلے کمانڈر ایچیف اپنا خیال ظاہر کریں گے۔ یہ بتائیں ہم کہاں کھڑے ہیں۔“

”میں سر کمانڈر ایچیف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کی آمد میں لہرزش تھی۔ پھر وہ پکپاتی آواز میں کہنے لگے :

”ہم لوگوں کے پاس آگ بھانے کے ذرائع ضرور موجود ہیں ہم اپنی کوشش بھی شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح ان کے فوجی شہید ہوں گے۔ اور آگ بجھ جائے گی یا نہیں۔ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”تو کیا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آگ پر قابو پانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اور پورے ملک کو داکھ ہو جائے اور جانے۔ پورے عوام کو تہس نہس ہونے دیا جائے؟“ صاحب نے غصے میں آکر کہا۔

”جی نہیں۔ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ کمانڈر بولے۔ ”اور ہم ایسی ہی ایک ترکیب لے کر آئے ہیں۔“ انشارج کی ٹیم کے انچارج نے بلند آواز میں کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے سر کہ ان کی تجویز پہلے سن لی جائے۔ آئیے جان ڈگی صاحب۔“ صدر صاحب نے اس سے کہا۔

جان ڈگی اٹھ کر سیٹج پر آیا اور اس نے تقریر شروع کی : ”یہ آگ ایسی آگ ہے کہ اس میں آپ کے ملک کا سب کچھ جل کر داکھ ہو سکتا ہے۔ لیکن انشارج آپ کا دوست ہے۔ ہمیشہ آپ کے کام آیا ہے۔ لہذا آج اس مرحلے پر بھی انشارج ہی آپ کے کام آئے گا۔ انشارج خود یہ آگ بجھائے گا۔“

”کیا !!! سب کے سب چلائے۔“

”ہاں ! انشارج کی فوج یہ سارا کام خود کرے گی۔ اپنے آلات، اپنے کیمیکلز اور اپنے ذرائع سے آگ پر قابو پائے گی۔ دوستی کا حق ادا کریں گے ہم۔“

”واہ ! یہ ہوتی تا بات۔ اس سے خوب صورت بات ان حالات میں بھلا اور کیا ہوگی۔“

”ہوں ! اس کی تفصیلات مختصر طور پر بتائے دیتا ہوں۔ جان ڈگی نے کہا۔ سب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ لوگوں کو دارالحکومت خالی کرنا ہوگا۔“

”جی کیا مطالب؟ سب ایک ساتھ بولے۔“

”جی ہاں، تمام گھروں کو خالی کرنا ہوگا۔ نہ صرف دارالحکومت



کو خالی کرنا ہو گا، بلکہ آس پاس کے شہروں اور دیہاتوں کو بھی خالی کرنا ہو گا۔ اور وہ بھی ایک دودن کے لیے نہیں۔ ایک آدھ ماہ کے لیے نہیں۔ پورے چھ ماہ کے لیے۔ پچھ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد اس آگ کو مکمل طور پر بجھایا جاسکے گا۔ اس میں انشارج کے کئی آدمی شہید ہوں گے، آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہم دوستی کا حق ادا کرنے آئے ہیں۔ حق ادا کریں گے۔ اپنے آدمی مردائیں گے۔ اپنی ہر چیز استعمال کریں گے۔ یہ کوئی معمولی آگ نہیں ہے۔ اس سے بڑی آگ شاید پوری دنیا میں پہلے کبھی نہیں لگی ہوگی۔ پورے ملک کے فوجیوں کے لیے اسلحے کا ذخیرہ اس ڈپو میں موجود ہے۔ آخر میں تک کہ کر وہ رک گیا۔

تھا۔ آگ سوچ میں ڈوب گئی۔ سوچ کے سمندر میں اتر گئی۔ ہر کوئی بس صرف یہ سوچ رہا تھا کہ انشارج کا نمائندہ بالکل درست کہہ رہا ہے، یہ لوگ کس قدر مخلص دوست ہیں۔ ان حالات میں بھلا کوئی اپنی فوج کے آدمی ہلاک کرانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی فوج۔ اپنا سامان دیتا ہے۔ اور شرط کس قدر سیدھی ہے۔ صرف پچھ ماہ کے لیے سارے شہر کو

اور آس پاس کے شہروں کو خالی کرنا ہو گا۔ تمام لوگوں کو باہر نکالنا ہو گا۔ تو کیا ہے۔ پورا ملک تو بیچ جائے گا۔ اسلحہ تو بیچ جائے گا۔ سارا تباہ ہونے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ کچھ تو بیچ جائے۔ ورنہ ایسی حالت میں اگر شادجستان حملہ کر دے تو ہم کیا کریں گے۔ کیا ہم جنگ لڑنے کی پوزیشن میں رہ جائیں گے۔ اس قسم کے خیالات ان سب کے ذہنوں میں آ رہے تھے۔ آخر صدر صاحب کی آواز سنائی دی:

”ٹھیک ہے سٹر جان ڈگی۔ ہم... ایک منٹ ستر۔ ایسے میں ایک آواز ابھری۔ اس آواز میں ادب تھا۔ دبدبہ تھا۔ دلولہ تھا۔ اور نے نے کیا کچھ تھا کہ سب اس آواز کی طرف گھوم گئے۔ کون صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ بات کریں، اجازت صدر صاحب بولے۔ ان سب نے دیکھا۔ ایک دُبلّا پتلا فوجی آفیسر اٹھ کر میں جنرل مشرف ہوں۔ آپ کی اجازت سے کچھ عرض کرنا ہوں۔“



"سر۔ ہمدردے مخلص دوست ہم سے چھ ماہ مانگتے ہیں یہ اس آگ پر چھ ماہ میں قابو پائیں گے۔ گویا چھ ماہ مسلسل اس ڈپو میں آگ بھڑکی رہے گی۔ تو کس حد تک ذخیرہ جلے گا۔ کس حد تک جلے گا۔ اور پھر ہر شہر کو اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ چھ ماہ کے لیے لاکھوں لوگ آخر کہاں جائیں گے۔ چھ ماہ وہ کہاں رہیں گے۔ جب میزائل ان نزدیکی شہروں سے بھی دور دراز کے شہروں پر وار کر رہے ہیں۔ میزائل تو پچاس ساڑھ کلو میٹر تک کر رہے ہیں۔ بلکہ کچھ میزائل اس سے بھی آگے گزر رہے ہیں تو پھر صرف دارالحکومت کو اور آس پاس کے شہروں کو کیوں خالی کیا جائے۔ پھر تو پودے ساڑھ ستر کلو میٹر دور تک کے شہروں کو اور دیہاتوں کو خالی کرانا ہو گا۔ یہ کام خود ایک مصیبت ہو گا! یہاں تک کہ کر جنرل مشرف خاموش ہو گئے۔

"تب پھر۔ آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا تجویز پیش کر سکتے ہیں کیا آپ کے ذہن میں اس کے علاوہ کوئی اور حل ہے۔" صاحب بولے۔

"ہاں سر۔ میرے پاس ایک عدد حل ہے۔ اس سے نہایت مختصر۔ اس سے حد درجے آسان اور قابل عمل۔ جنرل

مشرف مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟ سب لوگ بول پڑے۔

"میں اس آگ پر صرف ایک ماہ میں قابو پا کر دکھاؤں گا۔" کیا!!! سب کے سب چلائے۔

"ہاں سر۔ صرف ایک ماہ میں۔ اور کس ایک گھر کو خالی کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ زیادہ خطرے میں دارالحکومت اور آس پاس کے دیہات یا شہر نہیں ہیں۔ ان سے آگے والے شہر اور دیہات زیادہ خطرے میں ہیں۔ ہم کس کس کو خالی کرائیں گے۔ ہم اپنے اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے سب لوگوں کو اپنے گھروں میں رکھتے ہوئے یہ کام صرف ایک ماہ میں کر دیکھیں گے۔"

جنرل مشرف کے الفاظ نے سناٹا طاری کر دیا۔ جان لگی کا چہرہ بالکل مرجھا گیا۔ یوں لگا جیسے اس کے جسم میں خون کی ایک بوند نہ رہ گئی ہو۔ آخر صدر صاحب کی آواز سنائی دی:

"بہت خوب جنرل مشرف۔ اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ آپ ابھی اور اسی وقت کام شروع کر سکتے ہیں۔"

لیکن۔ شرط ایک ہے۔ وہ بولے۔

مشرق کے سامنے جا کھڑے ہوئے :

آپ؟ اس کے منہ سے مارے جرت کے نکلا۔

تو آپ ہمیں جانتے ہیں؟ انپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ جیسے لوگ نہ ہوں تو ملک کا نہ جانے کیا حال ہو جائے۔

تب پھر۔ اپنے ان سپاہیوں میں ہمیں بھی شامل کر لیں،

اس لیے کہ ہم بھی نمازی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ اور دین کے دوسرے احکامات پر کاربند ہیں۔

آپ کو۔ شامل کروں۔ آپ تو میرے ساتھ رہ کر کمان

کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں آپ سب کو خوش آمدید

دہ خوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ مسلمان اللہ کی حضور

کے دُعا کر رہے تھے اور پھر اسلحے کے ڈپو کا ذخیرہ کر

یہ ایک خوف ناک ترین اور ہولناک ترین ذبح گاہ تھی۔

ایسے میں شوکی کو ٹی ایس ملک کا خیال آ گیا۔ وہ اسے

کس بھی نظر نہ آیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ بہت

چلو چھٹی ہوئی۔ پیچھا چھوٹا۔

اسلحے کے ڈپو پر جب ان لوگوں نے بڑی بڑی مشینوں کے

ایسے بانی برسیا تو آگ اور بھڑک اُٹھی۔ یہ دیکھ کر جنرل

ادہ۔ تو آپ کی کوئی شرط بھی ہے۔ صدر صاحب چورس

”یہ سر۔ شرط تو انشاد کے نمائندے جان ڈگی ہیں۔

نے بھی پیش کی ہے۔ میری شرط ان کی شرط سے ملے

آسان ہے۔

”اور وہ کیا ہے؟“

”صرف اور صرف یہ کہ اس کام کے لیے مجھے سات

دینے ہائیں۔ اور وہ فوجی پانچ وقت کے باجماعت

ہوں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہوں۔ دین کے باقی احکامات

پر مکمل طور پر عمل پیرا ہوں اور بس۔ ایسے آدمی ہیں

کر دے دیے جائیں۔ ساتھ ہی وہ شہادت کے لیے

تیار ہوں۔

”یہ کیا مشکل ہے۔ ہمدانی فوج میں ایسے اُن گنت

میں۔ جو آپ کا اعلان سن کر خود اپنے آپ کو

کہ دیں گے۔ انپکٹر حمید کی آواز ابھری۔

”بالکل ٹھیک۔ اسی وقت فوج میں یہ اعلان کر دیا جائے

صدر صاحب نے حکم دیا۔

اعلان کے صرف ایک گھنٹے بعد جنرل مشرف کے پاس

ایسے شاہد بنائے گئے کہ فوجی سردوں پر کفن باندھے

گئے۔ ایسے میں انپکٹر حمید اپنے ساتھیوں کے ساتھ

Scanned By Muhammad Nadeem



مشرّف پریشان ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک کھلے میدان میں آئے۔ دو رکعت نماز ادا کی گئی اور پھر جرنل ان الفاظ میں دعا کی :

”یا اللہ ! تُو نے پانی میں آگ کو بجھانے کی تاثیر کی ہے۔

لیکن ہم آگ پر پانی برساتے ہیں اور آگ اور پانی کی تاثیر اور بھڑکتی ہے۔ میرے ملک۔ تو پانی کو اس کی تاثیر والا ہی رہنے دے۔ ہماری مدد فرما۔ آمین !

اب جو پانی برسایا گیا تو آگ نہ بھڑکی۔ فوجی خوش ہوئے اور زور شور سے پانی برسانے لگے۔ یہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔

موسلا دھار بارش کر دی اور پورے ایک ماہ کے دوران کی مسلسل بارش ہوئی۔ ادھر فوجیوں نے پانی برسایا۔ اس طرح پورے ایک ماہ سے بھی بہت پہلے آگ پر قابو پا لیا گیا۔ اگرچہ ایک وقت تک اسلحے کا قریباً دو تہائی حصّہ جل چکا تھا، لیکن تہائی ذخیرہ بچا لیا جانا۔ یہی کوئی معمولی بات نہ تھی اور یہی اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوا تھا۔ جرنل مشرف اور اس کے فوجیوں کا سچا جذبہ تھا۔ ایک ماہ بعد وہ سب ایوانِ عدالت موجود تھے۔ صدر صاحب کو رہے تھے :

پورا ملک جرنل مشرف کو اور ان کے ساتھیوں کو سراہتا ہے۔ جرنل مشرف نے وہ کام کیا ہے کہ دہشتی دنیا تک

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F-890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi

www.rahmatullah.com  
www.rahmatullah.com  
www.rahmatullah.com



”بہت بہت شکریہ جمید۔ اور جنرل مشرف۔ آپ وہ لوگ  
ہیں۔ جن کی وجہ سے اس ملک کا نام روشن ہے۔ اللہ تعالیٰ  
آپ لوگوں کو جزا عطا فرمائے۔“  
”آمین! سب نے کہا۔“

اور اجلاس برخاست ہو گیا۔ وہ دہاں سے سیدھے اپنے  
گھر آئے اور صحن میں آ بیٹھے۔ بیگم جمید نے فوراً کھانا سامنے  
رکھ دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انپکٹر جمید نے کہا:  
”اب ہمیں اس کیس پر غور کرنا ہے۔ آخر اس سازش میں  
کون لوگ شامل ہیں۔“

صاف ظاہر ہے۔ یہ کام خود انشادجہ کا ہے۔ اس نے  
یہ کام حیرال کے ذریعے کیا۔“

”لیکن حیرال نے یا اس کے انشادجہ کے ساتھیوں نے خود تو  
یہ آگ لگائی نہیں۔ اس نے تو ایک جال تیار کیا تھا۔ اس  
جال میں پہلے اس نے ہمیں پھانسا۔ پھر عوامی ہال میں  
ملک کے تمام بڑے آفیسر کی دعوت کرائی۔ تاکہ یہ سب  
لوگ دعوت میں شریک رہیں۔ مگر رہیں اور ادھر وہ اپنا کام  
کر جائیں۔ لہذا اس سازش میں ڈپو کے ملازم ضرور شامل  
ہو گئے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا  
تھا۔ وہ بولے۔“

## چھٹی لے لو

کئی سیکنڈ تک سکتے کا عالم طاری رہا، پھر صدر صاحب کی  
آواز ابھری:

”آپ کیا کہتے ہیں انپکٹر جمید؟“

”سر! یہ سو فی صد سازش تھی۔ میں آگ لگانے والی  
مخبروں کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دے دیں۔  
میں پورا اسرار افشاں میں آ جاؤں گا۔“

”بھلا اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“

”سر! اجازت کی بہت ضرورت ہے۔“

”میں سمجھا نہیں جمید۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”سر۔ جو لوگ مجرم ہوں۔ انہیں چھوڑا ہرگز نہیں  
گا۔ چاہے مجرم کوئی بھی ہوں۔“

”ٹھیک سہجہ۔ ہم کسی سے رعایت نہیں کریں گے۔“

تب پھر ہم اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کرتے ہیں۔“

”ہاں بالکل“

”ہم پہلے اپنے گھر کے غداروں کی گردنیں دبوچیں گے۔ پھر جبرال کا رخ کریں گے۔ کیا خیال ہے، آپ کا؟“ انہیں کامران مرزا نے کہا۔

”اصل خطرناک تو یہی گھر کے بھیدی ہوتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ اور اس کے لیے ہمیں اسلحے کے ڈپو کے قریب

ملازمین سے پوچھ گچھ کرنا ہوگی۔ یہ کام ہم صبح سے ہی شروع کر رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“

”دوسری صبح یہ ٹیم اسلحے کے ڈپو میں پہنچ گئی۔ پہلے

ملازمین کے رجسٹر چیک کیے گئے۔ پھر وہ تین گروپوں میں بٹ گئے اور ایک وقت تین تین ملازمین کو چیک کیا جانے لگا۔ ملازمین سے ایک عام سوال یہ کیا گیا:

”جب آگ لگی۔ آپ اس وقت کہاں تھے؟“

قریباً دو سو ملازمین نے اس سوال پر جواب دیا:

”ہم اس روز چھٹی پر تھے۔ دیکھاؤ میں ہماری

موجود ہیں۔“

جب ان درخواستوں کو چیک کیا گیا۔ تو واقعی ان لوگوں

نے اس رات چھٹی لی ہوئی تھی۔ وہ رات کی ڈیوٹی والے

ملازم تھے۔ ان سب کے کاغذات جب چیک کیے گئے تو یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ وہ سب کے سب جاہانی تھے۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ ان دو سو ملازمین کو ایک ہال میں لایا گیا:

”آپ دو سو ملازمین نے اس روز رات کو چھٹی کیوں لی تھی؟ انہوں نے بتوچھا۔“

”ہمیں اپنے گھروں میں کچھ کام تھے۔“

لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ دو سو کے دو سو ملازم۔ جنہیں کچھ کام تھا۔ جاہانی ہیں۔“

”جی۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔ ان کے رنگ اڑ گئے۔

”مجھے ان پر شک ہے۔ یہ گہری سازش ہے۔ آگ لگانے والوں کو پتا تھا۔ سب سے پہلے ڈپو کے ملازم مریں گے۔ لیکن آگ لگانے والے نہیں چاہتے تھے کہ

جاہانی ملازم بھی مارے جائیں۔ انہیں ان جاہانیوں سے

خاص ہمدردی تھی۔ لہذا انہیں اشارہ دیا گیا کہ یہ اس

رات کو چھٹی کی درخواست دے دیں اور ڈپو کا رخ نہ

کریں۔ کیوں ظالمو۔ یہ بات درست ہے یا نہیں؟“

ان کے رنگ پہلے ہی اڑے ہوئے تھے۔ ان الفاظ کے

بعد تو وہ تھر تھر کانپنے لگے۔



”بتاؤ۔ کس نے تم لوگوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ چھٹی لے لو۔  
وہ گنگ کھڑے رہے۔ آخر انیکٹر جمشید نے کہا:  
”یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے۔ ان پر سختی کرنا  
کی۔ لہذا انھیں اٹل لٹکا دیا جائے۔“

جب انھیں رسیوں سے جکڑا جانے لگا تو ان میں سے  
ایک چلا اُٹھے:

”ہماری جماعت کے خلیفہ کے نائب منور احمد نے ہمیں ہدایت  
دی تھیں کہ اس رات کوئی جاہانی اسلحے کے ڈپو میں نہیں رہے  
چھٹی کی درخواستیں لکھ دی جائیں۔“

”بہت خوب! مزا آگیا۔ منور احمد۔ انیکٹر جمشید نے ہدایت  
انداز میں کہا اور پھر ان سب کو عوالات میں ڈالنے کا حکم  
دے کر وہ دادی مرجان پہنچے۔ مرزا منور احمد نے ان  
لوگوں کو خوف زدہ انداز میں دیکھا۔ اپنے دارالخلافہ میں  
وقت بھی اس کی حالت غیر تھی:

”فرمائیے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟  
”خدمت تو ہم آپ کی کرنے آئے ہیں جناب۔ اسلحے کے  
کے دو جاہانی ملازمین کو آپ نے ۱۴ تاریخ کی رات کو

چھٹی لینے کی ہدایات کیوں دی تھیں۔ انھیں یہ حکم کیوں دیا  
تھا کہ اس رات کوئی جاہانی ڈپو میں نہیں رہے گا۔  
م۔ میں نے۔ نہیں تو جناب۔ میں نے تو ایسا کوئی  
حکم نہیں دیا۔“

لیکن جناب۔ وہاں ملازم جاہانیوں نے اس بات کا اقرار  
کیا ہے۔ آپ کا انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عدالت ان ملازمین  
کا بیان درست ماننے گی۔ نہ کہ آپ کا۔ اب صرف یہ بتا  
دیں کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی تھی کہ ڈپو میں آگ لگا  
دی جائے گی۔“

مجھے۔ نہیں تو۔ مجھے تو ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہے۔  
خیر۔ اب عدالت میں بیان دیجیے گا۔  
نہیں۔ ٹھہریے۔ بتاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے،  
ملازم خلیفہ ملک سے فرار ہو کر برطانیہ جا بیٹھے ہیں۔  
ان سے انھوں نے یہ ہدایت جاری کی ہے۔ ان کا حکم تھا کہ  
اپنے جاہانیوں کو اس رات ڈپو میں نہ رہنے دوں۔“

اے اچھا۔ آپ کے ان الفاظ کی بنیاد پر آپ کو گرفتار  
کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ملک کا شہری ہونے کے ناطے  
کوئی یہ خبر دے دار آفیسرز کو بتانی چاہیے تھی۔ نہ کہ  
خلیفہ کا حکم مان کر جاہانیوں کو بچانے کی کوشش کرنی



چاہیے تھی۔

”جھاڑ جھونک رہے تھے کیا۔ محمود نے طنزیہ انداز میں کہا۔  
”نہیں۔ یہ کام تو میں بچپن میں کیا کرتا تھا، ویسے  
آپ کو کیسے پتا چلا؟ اس نے گڑ بڑا کر کہا۔  
”ہم کچھ باتیں لوگوں کے چہرے دیکھ کر بھی بتا دیتے  
ہیں۔“ محمود مسکرایا۔

”بہت خوب۔“ اس نے کہا۔

”جسسی محمود۔ بُری بات ہے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر  
باتیں کرنے لگے۔ انھیں اندر لے آؤ۔ میں کچھ ان کے بارے  
میں بھی اندازہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔“

”جیلے صاحب۔“ محمود نے کہا اور اسے صحن میں لے آیا۔  
اسے کرسی پر بیٹھایا۔ وہ گھبرایا گھبرایا سا بیٹھ گیا۔ انیکٹر جمشید  
اور انیکٹر کامران مرزا بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ آخر دونوں  
سکرا دیے۔

”یہ نوجوان ٹھیک ہیں۔ ان پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔  
”جیلے۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے شک۔ لیکن اس وقت  
حضرت کیا خبر لے کر آئے ہیں۔ یہ تو ہم نے پوچھا ہی نہیں۔  
اوہ ہاں۔ بتائیں بھئی۔ آپ کیا کرتے رہے اس دوران  
جب کہ ہم آگ بجھا رہے تھے؟“

”جی۔ وہ بس۔ میں نے سوچا۔ میں بھی کوئی کام دکھا

چاہیے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ رات ہو چلی تھی۔ اندازاً  
نے گھر کا رخ کیا۔ آج کرنے کا کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا۔  
تفتیش کی گاڑی یہاں آ کر اٹک گئی تھی۔  
”سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟“

”جواب اس کا یہ ہے کہ ہم اشارہ جائیں گے۔ جیرال  
”مکرائیں گے۔ جیرال ہی ہمیں اس پوری سازش کی تفصیلات  
بتا سکتا ہے۔“

”اوہ بالکل ٹھیک۔ اب آئے گا مرزا۔ محمود نے خوش  
کر کہا۔

”میں اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

”ہائیں۔ یہ اس وقت کون آ گیا؟“ فرزانہ چونک اٹھی۔

”کوئی تو اللہ کا بندہ ہو گا۔“

”محمود دروازے پر پہنچ کر بولا۔

”کون صاحب ہیں؟“

”جی۔ جی یہ میں ہوں۔ ٹی ایس ایم۔“

”اچھا آپ ہیں۔ بزدل صاحب۔ یہ کہہ کر محمود نے دروازہ کھول دیا۔

”میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ لوگ جب  
آگ بجھا رہے تھے تو میں بھی اس وقت کچھ کام کر رہا تھا۔“

## ملاقات مجرمانہ

بغذ لٹے تک وہ سکتے کے عالم میں رہے، پھر انیکٹر جمشید  
کھڑے ہوئے :

بہت بہت شکریہ دوست — آپ ہم سے الگ رہ کر  
کام کر رہے ہیں — الگ ہی رہیں — جب کوئی ایسی خبر  
ملا، فوراً دے دیا کریں — آؤ دوستو — ہم ذرا عابد جیلانی  
سے دو دو باتیں کر آئیں۔

ایک آدمی سے دو دو باتیں کرنے کے لیے ہم سب کی  
ضرورت ہے — ہم ذرا اپنی دو دو باتیں کر لیں گے —  
اے ایس ایم صاحب کو بھی ان دو دو باتیں میں شریک  
کئے گئے۔ فادوق نے جلدی جلدی کہا۔

میسرے تصادی مرضی — خان رحمان — تم ہمارا ساتھ دو  
ان لوگوں کی باتیں سنو گے۔

میسرے پروفیسر صاحب فرمائیں۔ خان رحمان پروفیسر دادد کی

ہی دوں۔

”تو پھر دکھایا کوئی کام؟“  
”خیال تو یہی ہے۔“

”جائے۔ ہم سُن رہے ہیں۔“

”جان ڈگی نے خفیہ طور پر عابد جیلانی سے ملاقات کی تھی  
کیا!!!“

وہ سب ایک ساتھ چلائے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem



طرف مڑے۔ آگ لگنے کے زمانے میں انھیں اور ان کے ساتھیوں کو ہوش آ گیا تھا۔

بھئی میں بھی تھک گیا ہوں۔ اور ان کی باتیں سن کر تھک اٹا دوں گا۔

”ہماری باتیں تھکن اتارنے کا ٹانک ہیں کیا انکل؟ آفتاب پھر ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ غالباً وہ خود بخود میرا بیچا نے ہنس کر کہا۔

”پتا نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تھکن بے چاری غائب ہو جاتی ہے۔“ پروفیسر سکرائے۔

”ہوئی جو بے چاری۔“ انپکٹر کامران مرزا نے منہ بنایا۔

انپکٹر جمشید اور وہ اسی وقت گھر سے روانہ ہو کر عابد جیلانی کی کوٹھی پہنچے۔ راستے میں وہ سوچ رہے تھے کہ عابد جیلانی عین اس وقت ان کے گھر آئے تھے۔ جب حیرال ان کے گھر سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنا کوئی مسئلہ لے کر آئے تھے، لیکن وہ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دے سکے۔ لہذا انھوں نے انپکٹر کامران مرزا کو بھی بتا دیا کہ وہ کس دسلے میں آئے تھے۔

کوٹھی کے دروازے پر دو مسلح پولیس مین موجود تھے۔ وہ انھیں پہچانتے تھے، لہذا فوراً ان کا کارڈ لے کر اندر چلے گئے۔ دو منٹ بعد دونوں عابد جیلانی کے ڈرائنگ روم میں ان کے

ساتے بیٹھے تھے۔ اور وہ حیرت زدہ سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر انپکٹر جمشید بولے:

”آپ ایک مسئلے لے کر میرے پاس آئے تھے۔ وہ تو ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ ختم ہو گیا، پھر ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ غالباً وہ خود بخود میرا بیچا پھوڑ گیا۔“

”اوہ اچھا۔ چلیے خیر۔ جس وقت اسلحے کے ڈپو میں آگ لگی ہوئی تھی۔ آپ سے جان ڈگنی نے ملاقات کی تھی۔“

”نہیں تو۔ آپ سے کس نے کدیا؟“

”آپ اس بات کو چھوڑیں کہ ہم سے یہ بات کس نے کر دی۔“

”کتنے وقت انپکٹر جمشید کوئی ایس ایم کا خیال آ گیا۔ وہ دل کی دل میں مسکرائے۔“

”تو پھر آپ مجھ سے سن لیں۔ آپ کو کسی نے جھوٹی خبر سنائی ہے۔ میں نے جان ڈگنی سے کوئی ملاقات نہیں کی، اس لیے کی ہوتی تو بھی کیا یہ جرم تھا۔ وہ ہمارے ملک میں آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔ کوئی جرائم پیشہ تو

یہاں نہیں۔“

”آپ صرف اتنا بتادیں کہ ملاقات ہوئی یا نہیں؟ انپکٹر کامران مرزا سرد آواز میں بولے۔“

بہت خوب — ابھی تم یہیں ٹھہرنا۔ یہ کہہ کر انپکٹر جمشید نے  
دو بند کر دیا اور اس کی طرف مڑے :  
آپ نے جان ڈگنی سے ملاقات ہوٹل کاروان میں کی تھی۔  
یہ بات درست نہیں۔ وہ بولا۔

انگریز ہم ہوٹل کے مالک کی گواہی دلا دیں — تو  
کوشش کر دیکھیے — ویسے فرض کیا — میں نے ملاقات کی  
تھی — تو پھر کیا یہ کوئی جرم ہے؟ اس نے جل جھن کر کہا۔  
ہاں! بعض وجوہات کی بنا پر یہ جرم بن سکتا ہے اور میں  
یہی بات ثابت کروں گا کہ یہ ملاقات مجرمانہ تھی۔

پہلے آپ ثابت کریں، پھر مجھ سے بات کریں۔  
جی نہیں — ہم ثابت بعد میں کرتے رہیں گے۔ بات آپ  
سے پہلے کریں گے۔  
کریں — پھر بات۔

آپ صرف یہ بتادیں کہ اس ملاقات میں کیا بات چیت  
ہوئی تھی — ورنہ آپ کو جیل جانا ہوگا۔

کیا کہا — مجھے جیل جانا ہوگا — آپ کا دماغ تو درست  
ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے — میں کون ہوں؟

آپ وزیر خارجہ ہیں — لیکن اگر اس ملک کا صدر بھی  
ملک سے غدا دی کرے گا تو ہم اسے بھی گرفتار کریں گے۔

”بالکل نہیں! انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔  
”شکریہ! کیا میں ایک فون کر سکتا ہوں؟  
”دس فون کریں! انھوں نے بھڑا کر کہا۔

”شکریہ! دس فون کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔  
مسکرائے اور گھر کے نمبر ڈائل کیے فوراً ہی محمود کی آواز  
”اسلام علیکم محمود — یہ میں ہوں — ہم جانا چاہتے ہیں۔  
جان ڈگنی نے عابد جیلانی صاحب سے کب اور کہاں ملاقات  
”جی ہسٹر! محمود نے کہا اور ریسورٹی ایس ایم کی طرف  
ہوئے بولا :

”آبا جان جانا چاہتے ہیں کہ جان ڈگنی نے عابد جیلانی  
کہاں اور کب ملاقات کی تھی۔

”اچھی بات ہے! اس نے کہا اور ریسورٹ لے لیا :  
”سر — یہ ملاقات کاروان ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۱

ہوئی تھی — پہلے جان ڈگنی اس کمرے میں پہنچا تھا۔  
اس نے عابد جیلانی کو فون کیا — عابد جیلانی فوراً وہاں

اور دونوں نے قریباً ایک گھنٹے تک بات چیت کی۔  
بات کی گواہی ہوٹل کا مالک بھی دے گا، کیونکہ وہ

مالک عابد صاحب کو خود کمرے کے دروازے تک پہنچا  
آیا تھا۔ اور اس نے اندر جان ڈگنی کو بھی دیکھا تھا۔



اس کا ملک دشمن ہونا ڈپو والے واقعے سے ثابت ہے۔  
 ”وہ کیسے — اور اگر وہ مجرم ثابت ہو چکا تھا تو اسے  
 گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟“

”اس نے ہمارے ملک میں براہ راست کوئی جرم نہیں کیا کہ  
 اسے گرفتار کیا جاتا — لیکن جو تجویز وہ لے کر آیا تھا،  
 اس سے ملک دشمنی کی بوس آتی تھی۔ وہ سارے شہر کو بلکہ  
 آس پاس کے شہروں کو خالی کرانا چاہتا تھا۔ اور آگ بجھانے  
 کے لیے چھ ماہ کی مہلت مانگ رہا تھا، جب کہ ہمارے  
 دیروں نے آگ پر صرف ایک ماہ میں قابو پا لیا اور کسی کو گھر  
 بھڑک کر نہیں جانا پڑا۔ ہاں جن کے مقدمہ میں شہادت تھی، وہ  
 آگ پر قابو پانے کے دوران شہید ہو گئے۔ آخر انشاجہ  
 کی ٹیم چھ ماہ تک یہاں کیا کرنا چاہتی تھی؟ سوال تو یہ  
 ہے۔ اور آپ نے اس ٹیم کے انشاجہ سے خفیہ ملاقات  
 کی ہے، جب کہ وزیر خارجہ ہونے کے ناطے آپ کسی غیر ملکی  
 سے خفیہ ملاقات نہیں کر سکتے۔“

”مجھے قانون پڑھانے کی ضرورت نہیں: عابد جیلانی نے  
 بتا کر کہا۔“

”میں اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی، پھر ایک ملازم لمبے  
 قدم کے ایک بارعب آدمی کو لیے اندر داخل ہوا، لمبے آدمی

”حد ہو گئی۔ اب میں غدار بھی ہو گیا۔ انپکٹر جی  
 آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ آپ ذرا خاموش رہیں۔  
 ابھی آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ اس نے نفرت  
 انداز میں کہا۔“

پھر اس نے ذون پر کسی کے نمبر ملائے — سلسلہ  
 اس نے کہا:

”میں یہاں آپ کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔  
 انپکٹر جمشید اور انپکٹر کامران مرزا مجھے پریشان کیے  
 ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دسیود دکھ دیا۔“

”آپ مدد کے لیے کسی کو بھی بلا لیں۔ ہم اپنا کام  
 رہیں گے۔ یا تو آپ جان ٹرگی سے ملاقات کی تفصیل  
 گے۔ یا پھر حوالات میں جائیں گے۔“

”آپ دونوں کے دماغ چل گئے ہیں۔ میں اس ملک  
 وزیر خارجہ ہوں۔“

”تو کیا وزیر خارجہ ہونے کے ناطے آپ کسی سے  
 خفیہ ملاقات کر سکتے ہیں۔ کسی ملک دشمن سے؟  
 طنزیہ انداز میں کہا۔“

”اگر جان ڈگی مجرم ہے تو ضرور میرا اس سے بات  
 غلط ہے۔ اس نے کہا۔“

نے فوراً کہا۔

دیکھ رہے ہیں۔

جیلانی صاحب - انسپٹر جمشید اور انسپٹر کامران مرزا آپ پریشان کر رہے ہیں؟

”ہاں! یہی بات ہے۔“ اس نے فوراً کہا۔

”تب پھر آپ کو تو فوراً پولیس کو فون کرنا چاہیے تھا۔“  
”اوہ ہاں! مجھے پولیس کو بلانا چاہیے تھا۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ یہ کام اب میں کیے دیتا ہوں۔“  
”اور پھر لمبے آدمی نے پولیس کو فون کر دیا، لیکن ان کے

نام لیے بغیر کہا:

”دو آدمی وزیر خارجہ کو پریشان کر رہے ہیں۔ فوراً آئیں۔“  
”میں ان کا وکیل شوکت غزالی بات کر رہا ہوں۔“ ان الفاظ کے

ساتھ ہی اس نے ریسور رکھ دیا۔  
”دونوں بکے چھروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔“

”تو آپ ان کے وکیل ہیں۔“ لیکن آپ نے آتے ہی پولیس کو فون کر دیا۔ یہ نہیں پوچھا۔ بات کیا ہے؟

”یہ آپ اب بتا دیں۔“  
”پولیس آفیسر ان کی طرف مڑا اور زور سے اچھلا۔“

”یہ تو انسپٹر جمشید اور انسپٹر کامران مرزا صاحبان ہیں۔“  
”پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کوئی جرم کرنے پر انھیں

غزالی نے سُن کر بُرا سا منہ بنایا اور جھٹکا کر بولا:  
”بس! آپ اتنی سی بات پر انھیں گرفتار کرنے کا خواب



گرفتار نہیں کیا جا سکتا؟

بیلا کی باتیں۔ اور بس۔  
”یہ باتیں بالکل سنائی میں کرنے کی بجائے ضرورت تھی؟“

”بھئی جھنڈ مسکرائے۔  
”ہم نے کسی کو اس گفتگو میں شریک کرنے کی ضرورت نہیں  
”بھئی تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اتنی سی بات پر بھی ہم  
”پر شک کیا جا سکتا ہے۔“

”کیا اس گفتگو کو ریکارڈ کیا گیا تھا۔ چلیے اس گفتگو کی  
”کیٹ دے دیں۔“

”افسوس! ہم نے اس بات چیت کو ریکارڈ نہیں کیا تھا۔  
”آپ سن رہے ہیں کیل صاحب؟“

”ہاں! سن رہا ہوں۔ اور یہ بالکل درست جوابات دے رہے ہیں۔  
”چلو پھٹی ہو گئی۔ پھر تو اس ملک میں کوئی کچھ کرے، وہ  
”ملک درست ہو گا۔ چاہے ملکی راز ہی کیوں نہ غیر ملکی ایجنٹ  
”کے حوالے کر دیے جائیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ کیا کہ دیا آپ نے؟“ عابد جیلانی چلائے۔

”ہاں! میں آپ پر الزام لگاتا ہوں۔ آپ نے اس خفیہ ملاقات  
”کے راز جان ڈگی کے حوالے کیے ہیں۔  
”کیا! وہ ایک ساتھ چلائے۔

”ضرور گرفتار کیا جا سکتا ہے، لیکن پہلے جرم تو ثابت ہو  
”اب اسے تفصیل سنائی گئی۔ پولیس آفیسر چکرا کر رہا  
”گیا، اور پھر اس نے کہا:

”بہتر یہ ہو گا کہ آپ معاملہ عدالت میں لے جائیں  
”نہ آپ انہیں گرفتار کرائیں، نہ یہ آپ کو۔“

”ہم ایسا کر لیتے ہیں، لیکن اگر یہ ملک سے فرار ہو  
”گئے تو کیا آپ دسے دار ہوں گے؟“ انھوں نے طنز یہ لہجے  
”میں کہا۔

”نہیں۔ لیکن یہ تو ملک کے وزیر خارجہ ہیں۔ فرار  
”کیوں ہونے لگے؟

”کیوں چھپ تو سکتے ہیں۔“

”آخر مجھے پھسنے کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے کیا جرم کیا ہے  
”ہے؟“ عابد جیلانی نے کہا۔

”آپ ہمارے ملک کے وزیر خارجہ ہیں۔ انشاورج کے ایک

”اہم آدمی نے جس پر ہم پہلے ہی شک کر رہے ہیں، آپ نے اس خفیہ ملاقات  
”آخر خفیہ ملاقات کیوں کی۔ اچھا چلیے، یہ بتادیں کہ اس ملاقات  
”میں کیا باتیں ہوئیں؟“

”وہ ادھر ادھر کی باتیں تھیں، موسم کی باتیں۔ صحت اور

”ارے باب دے۔ کیا آپ یہ دعویٰ صرف اس ملاقات کی  
سید پر کر رہے ہیں۔ محمود کانپ گیا۔“

اس بنیاد پر تو میں نے صرف ان سے ملاقات کی تھی۔  
اور ملاقات کے دوران میں جو کیا کرتا ہوں۔ وہ تم جانتے

تو ہم اسی وقت روانہ ہو جاتے ہیں۔“

”دو عدد میچسٹریٹ ضرور ساتھ لے آنا اور جو چیز برآمد کرو،  
اس پر ان کے دستخط کرا لینا، کیونکہ یہ معاملہ ٹیڑھا ہے۔“  
”اچھی بات ہے۔“

انھوں نے ریسور دکھ دیا اور عابد جیلانی کی طرف دیکھا۔  
”اے کے پھرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا،  
لیکن آپ خود تلاشی کیوں نہیں لے لیتے؟“

”ہم بھی تلاشی میں اپنے ساتھیوں کی مدد کر سکتے ہیں، اگر  
ضرورت پیش آئی۔ ارے ہاں! ایک کام تو وہ ہی گیا۔“  
”کہہ کر انھوں نے اکرام کو فون کیا۔“

”اکرام۔ تم ہوٹل کاروان کے مینجر کو عابد جیلانی صاحب  
کا کوٹھی پر لے آؤ۔“  
”جگا بہت بہتر۔“

اور انھوں نے ریسور دکھ دیا۔

## خبریں

کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ جوں محسوس ہوتا تھا  
جیسے اب کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔ آخر عابد جیلانی کی آواز اچھڑی  
”ٹھیک ہے۔ آپ اس بات کا ثبوت پیش کریں، اور“

آپ اپنی ملازمت پر برقرار نہیں رہ سکیں گے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ مجھے اپنے گھر کی تلاشی لینے کی  
اجازت دیں۔“

”اجازت دی۔“ وہ بولے۔

”انپکٹر جمشید نے اسی وقت گھر فون کیا، محمود کی آواز  
کو وہ بولے۔“

”یار معاف کرنا۔ تم لوگوں کے لیے ایک کام نکل رہا ہے  
ہے۔ عابد جیلانی صاحب کے گھر سے غیر ملکی مواد تلاش کیا“

”ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ وہ انٹراجہ کے جاسوس کے طور پر“

”کام کر رہے ہیں۔“



معلوم کر لینا چاہتا ہوں۔ کیا بات چیت ہوئی تھی۔  
میں نے ملاقات ہی نہیں کی۔

عین اس لمحے اکرام ہوٹل کے مینجر کو لیے اندر داخل ہوا:  
”یہ مینجر صاحب ہیں۔ ہوٹل کے مالک بھی یہی ہیں۔ میں اسے  
لے کر پہلے عابد جیلانی صاحب کی کوٹھی پہنچے، وہاں آپ نہ

ملے تو اسے یہاں لے آیا۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ عابد  
جیلانی صاحب نے جان ڈگ سے ان کے ہوٹل کے ایک کمرے  
میں ملاقات کی تھی۔ یہ اس ملاقات کے چشم دید گواہ ہیں۔“

”کیوں شاہزادے۔ کیا یہ بات تم نے تسلیم کی ہے۔ یا  
یہ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں؟ عابد جیلانی نے آنکھیں نکالیں۔  
”یہ میں نے اقرار کیا ہے سر۔ اس لیے کہ میں ان لوگوں  
کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اور مجھے بڑا دہ بولے۔  
”آپ کا سوچ تو اب غروب ہونے والا ہے۔ جس کے  
پچھے یہ لوگ پڑ جاتے ہیں، اسے کب چھوڑتے ہیں؟  
تب پھر تمہاری قبر بھی ان کے ساتھ بنے گی۔“

”ارے باپ دے۔ یہ تو الٹا کام ہو گیا۔ انیکٹر صاحب  
آپ نے تو یقین دلایا تھا کہ جیلانی صاحب کے خلاف ثبوت مکمل  
ہو چکا ہے۔“

جلد ہی پھوٹی پارٹی میجر ٹیٹوں سمیت آگئی۔ تلاشی کا عمل  
شروع ہوا۔ انیکٹر جمشید، انیکٹر کامران مرزا، خان رحمان اور  
پروفیسر داؤد عابد جیلانی اور اس کے وکیل کے پاس بیٹھے رہے۔  
”بہت زبردست محاورے بازی ہو رہی تھی جمشید۔  
جب تمہارا فون آیا۔ پروفیسر داؤد بولے۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ کام تو یہ تلاشی کے دوران بھی  
لیں گے۔“ انھوں نے کہا۔

اور پھر صرف پندرہ منٹ بعد چھوٹی پارٹی ایسے کا  
لیے وہاں آگئی۔ جن کی رو سے عابد جیلانی صاحب انٹرویو  
کے جاسوس کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس کے وکیل  
جب وہ کاغذات دیکھے تو ہنسا کر اٹھ کھڑا ہوا:

”معاف کرنا جیلانی صاحب۔ اب میں آپ کی وکالت نہیں  
کروں گا۔ اب آپ جانیں، آپ کا کام۔“

اور پھر جیلانی صاحب کو گرفتار کر کے دفتر لایا گیا:  
”ہاں! اب بتائیں۔ آپ نے جان ڈگ سے کیا بات  
کی؟ انیکٹر جمشید نے کہا۔

”نہیں بتاؤں گا۔ تم مجھے حوالات میں زیادہ دیر نہیں  
سکو گے۔“

”یہ بات میں جانتا ہوں۔ اسی لیے اس سے پہلے پہلے

اس میں کیا شک ہے۔ اکرام کی بجائے انیکٹر جمشد بول اٹھے۔

”اگر اس میں کوئی شک نہیں تو پھر جیلانی صاحب والی بات کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے گھبرا کر کہا۔  
 ”ہر شخص اپنی عادت کے مطابق بات کرتا ہے۔ اکرام کی تم ان کا تحریری بیان لے چکے ہو؟  
 ”یس سر۔“

”تو پھر اب انہیں ملک کی کوئی عدالت دیا نہیں کر سکتی۔ ان کے خلاف ہمارے پاس مکمل ثبوت ہیں۔“  
 ”اس کے باوجود رہائی میرا مقدر ہے اور ادھر میں رہا کر پناہ دے گا۔ لہذا اب میں وہاں جا کر رہ سکتا ہوں، ہوں گا، ادھر تم پر مصیبت نازل ہو جائے گی، اس لیے کہ۔۔۔“  
 ”اس لیے کہ کیا؟“  
 ”اس لیے کہ انشاد میرے لیے بھی جبرال کو بھیج سکتا ہے۔“  
 ”کیا؟! وہ بلند آواز میں چلا اٹھے۔“

ایک گھنٹے بعد صدر صاحب کا فون آیا، وہ کہہ رہے تھے:  
 ”تم نے کیا کیا ہے جمشد۔ عابد جیلانی کو حوالات میں بند دیا۔ ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے۔“  
 ”کیا اس سے پہلے کسی مجرم کو گرفتار کرنے سے پہلے میں آپ نے اجازت لیتا ہوں سر؟“

جمشد لمحے سکتے کے عالم میں گزرا گئے، پھر انیکٹر جمشد کھوئے کھوئے انداز میں بولے:



"نہیں۔ لیکن یہ معاملہ تو وزیر خارجہ کا تھا۔"

"ایک غدار کا کہیں سر۔"

نصیر کو نا ہو گا۔  
آپ جا سکتے ہیں۔ میرے غصے کو آواز دینے کی کوشش کریں۔

"وہ تم کیا کر لو گے؟ وہ غرائے۔"

"پھر آپ یہاں سے جا نہیں سکیں گے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔"

عابد جیلانی کچھ کہتے کہتے رک گئے، پھر سر کو ایک جھٹکا دے کر باہر نکل گئے۔ باہر ان کی لمبی سی ایک کار کھڑی تھی۔ باہر نکل کر اس نے طنزیہ انداز میں مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور جا کر کار میں بیٹھ گئے۔

"یہ کیا ہوا سر؟ اکرام بڑ بڑایا۔"

"عمادے صدر اس قدر مجبور ہیں۔ یہ بات بہت عجیب ہے۔ وہ بولے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب آپ کا کیا پروگرام ہے۔ اس طرح بھی کوئی کیس ختم ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔"

"نہیں! یہ کیس ختم نہیں ہوا۔ یہ کیس حیرال کو شکست دے بغیر ختم نہیں ہو گا۔"

"حیرال۔ اب یہاں کہاں۔ وہ تو انشارجہ جا چکا ہو گا۔"

"انشارجہ کی حکومت طرح طرح کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ تو دیتی رہے۔ تم کو ان ڈپٹی اس سے۔"

"ہمیشہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ عابد جیلانی کو حوالات باہر نکال دو، پھر چاہے وہ انشارجہ چلے جائیں۔"

"یہ نہیں ہو گا سر۔ وہ ہمارے ملک کے مجرم ہیں۔ انہیں یہیں کی حوالات میں رہنا ہو گا۔"

"ہمیشہ! تم نے میرا حکم نہیں سنا۔"

"آپ ایک غدار کو چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں سر۔"

"ہاں چلو! یہی بات سہی۔ بس تم چھوڑ دو۔ میرے لیے۔"

"چھوڑ دو۔"

"بہت بہتر سر۔ انیکٹر جمشید بولے۔"

"ان کا لہجہ اس لمحے سرد ہو گیا۔ ان کے ساتھی کہاں گئے۔ پھر وہ حوالات تک آئے۔ دروازہ کھلایا گیا تو عابد جیلانی نے طنزیہ انداز میں کہا:

"یکوں۔ ہو گی ناشکست۔"

"نہیں۔ شکست آپ کی ہے۔ انیکٹر جمشید بولے۔"

"دل کے چھپھو لے پھوڑنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اب۔"

یوری حکومت سے مبارک بادیں وصول کر رہا ہوگا۔

”تو کیا ہوا۔ ہم بھی تو دہاں جا سکتے ہیں۔“

”واہ! کتنا مزا آئے گا۔ جب ہمارا جیرال ہے

ہوگا۔ تو کیا ہم تیاری شروع کر دیں؟“

”ہاں بالکل۔“

## نکلنا ہوگا

”اور اب آپ عابد جیلانی کا کیا کریں گے؟ شوکی نے

”کل کے اخبارات میں پڑھ لینا“ انھوں نے پُرا

میں کہا۔

”دوسرے دن کے اخبارات میں عابد جیلانی کے

عادتے میں مرنے کی خبریں پڑھ کر وہ سکتے ہیں آگے۔“

جیرال اپنے عالی شان گھر میں موجود تھا۔ اس کے چہرے

پر شدید ناگواری کے آثار تھے۔ اس وقت تک وہ لاکھوں فون

اکھن تار اور اُن گنت خطوط وصول کر چکا تھا۔ ان سب میں

اسے اس مذہب دست کامیابی پر مبارک باد دی گئی تھی۔ اور

اب اس کی یہ حالت تھی کہ وہ مزید ایک بھی مبارک باد

وصول کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ایسے میں اس کے نائب

نے بتایا۔ انشارج کے صدر اس سے بات کرنا چاہتے

ہیں۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھا لیا :

”ہی سر۔“

”انشارج کے تمام بڑے لوگ آپ کے ساتھ ایک شام

مانا چاہتے ہیں۔“

”بھی اس شام کا وقت نہیں آیا سر۔ جیرال بولا۔

”وہ کیسے؟“



”ابھی میری مهم مکمل نہیں ہوئی۔“

”کیا مطلب۔ مکمل کیسے نہیں ہوئی۔“

”وہ بھلا اس دعوت میں کیسے آسکتے ہیں۔ جب کہ داخلہ صرف  
ہوڈ کے ذریعے ہو سکے گا۔“

”آپ انھیں نہیں جانتے سر۔ میں ان کے ملک میں اپنا  
اس شکست کا بدلہ لینے یہاں ضرور آئیں گے۔ بلکہ میرا کام کر چکا۔ اب ان کی باری ہے۔ وہ میری اپنے ملک  
ہے۔ وہ انٹارجہ میں داخل ہو چکے ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ تم نے ان کی آمد کے لیے تھے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جیرال پھر ان کے  
پیش نظر تمام راستوں کی فہرست نگرانی شروع کر رکھی ہے۔ مثال آنے والا ہے۔ لہذا بے خبری میں مار کھا گئے۔  
”یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس لمحے آگ لگائی جانے والی تھی، میں نے انھیں ایک  
وہ آچکے ہیں۔ اس لیے فی الحال یہ دعوت نہیں ہوگی۔ دوسری طرف معروف رکھا۔ لیکن اب ان کی باری ہے سر۔  
”لیکن مسٹر جیرال یہ دعوت تو ہو کر رہے گی۔“

”ٹھیک ہے سر۔ میں آجاؤں گا۔ لیکن نتیجے کی ذمہ داری میں تو کہتا ہوں۔ وہ ادھر کا رخ کرنے کی جرأت  
مجھ پر نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم خود ذمے دار ہوں گے۔“

”اچھی بات ہے۔ یہ دعوت کب اور کہاں ہو رہی ہے۔“

”کل۔ کونسل ہال میں۔ آپ اس شام کے سہانہ صبح اور پھر فون بند کر دیا گیا۔“

”اب جیرال نے ادھر ادھر فون کرنا شروع کیے۔ اپنے  
”او کے سر۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ بلکہ میں ابھی  
سے اپنے آدمی مقرب کر رہا ہوں، تاکہ اس دعوت میں سے پھیل گئیں۔ فرش پر اسے جوتے کا ایک نشان نظر  
ان میں سے کوئی داخل نہ ہونے پائے۔“

جیرال بولا۔

کیسی باتیں کرتے ہیں انکل آپ کچھ تو سوچیں۔ بھی شوکی  
تم بھی سامنے آ جاؤ۔

شوکی بھی تاریکی سے نکل کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا، جیرال  
اور بھی حیران ہو گیا :

باقی لوگ کہاں ہیں ؟

گھر کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔

تب پھر تم لوگ میرے گھر میں مہمان ہو، آ جاؤ بیٹھ کر  
بات کر لیتے ہیں، جیرال نے دوستانہ انداز میں کہا۔

پھر سبھی لوگ جیرال کے سامنے آ گئے۔

اے کہتے ہیں کاری گری۔ ہم سب لوگ آپ کے گھر میں  
داخل ہو گئے اور آپ کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔

واقعی۔ یہ میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے۔

اور ہم نے وہ گفتگو بھی سُن لی جو صدر نے آپ سے کی  
تھی۔ پھر آپ نے ہمارے بارے میں جو ہدایات دی

ہیں، ہم وہ بھی سُن چکے ہیں۔ آصف نے جلدی جلدی کہا۔

مان گیا میں تم لوگوں کو۔ تم حیرت انگیز صلاحیتوں کے  
مالک ہو۔ تم پہلے انشراحہ میں داخل کس طرح ہو گئے اور حد

تک میرے گھر میں بھی داخل ہو گئے۔ آخر کیسے ؟

آیا تھا۔ جو اس کے اپنے جوتے کانہیں ہو سکتا تھا،  
فرش بالکل گرد آلود نہیں تھا۔ یہ جوتا تو کیچڑ میں  
کر اندر لایا گیا تھا۔ اور جوتا تھا بھی قدرے چھوٹے  
سائز کا۔

یہ۔ یہ۔ یہ کیا۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟ جیرال کے  
سے نکلا۔

یہ بالکل اسی طرح ممکن ہے چچا جیرال جس طرح  
ہمارے گھر میں آ گئے تھے۔

اس آواز نے تو جیرال تو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔  
سر اٹھایا تو فادق سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا :

کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں ؟ جیرال بولا۔

ہاں ! یہ خواب ہی ہے، لیکن جاگتی آنکھوں کا خواب

کیسے پسند آیا انکل ؟ فادق کی شوخ آواز ابھری۔

تت۔ تو کیا۔ تم اکیلے ہو ؟

نہیں تو۔ میں کیوں ہوتا اکیلا۔ یار آفتاب۔

جاؤ تم بھی۔

گھر کے ایک کونے سے نکل کر آفتاب بھی اس کے برابر

آ کھڑا ہوا :

اس کا مطلب ہے۔ دونوں پارسیاں انشراحہ میں موجود ہیں۔



”ترکیبِ غیرِ سہ کے ذریعے“ قادی نے فوراً کہا۔

کے ہاندر قابو پایا تھا۔ اور اس طرح اسلجے کا پورا ڈپو نہیں

”اوہ! اس کا مطلب ہے، تم لوگ مختلف گرد ہوں میں تم ہو کر آئے ہو۔“

”میرا کام تو صرف اتنا تھا کہ ڈپو کو آگ لگا دوں۔ اس کے

”ہم نے اتنا تھا، آگ لگے۔ آپ ہماری ساری گری مان لیں اور ہاں۔ ہمیں کھانا دانا کھلا رہے ہیں یا نہیں؟“

”کی کوئی ذمے داری مجھے نہیں سونپی گئی تھی۔ اشتادجہ کی

”ضرورت کیوں نہیں۔ تم لوگ میرے مکان ہو۔“

”جیل کر داکھ ہونے تک میری ذمے داری ہے تو پھر میں

”یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی ایک ملازم اندر داخل ہوا اور کمرے میں اتنے بہت سے افراد کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا:

”آپ کی طرح ہم بھی با اصول ہیں۔ دیکھ لیں۔ اشتادجہ آ

”یہ۔ یہ کیا۔ یہ لوگ اندر کیسے داخل ہوئے؟“

”آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اب ہم اس دعوت میں ضرورت

”اسی سے اندازہ لگا لو کہ تم کتنے بڑے آٹو کے پٹھے ہو، اتنے لوگ اندر داخل ہو گئے اور تمہیں پتا تک نہیں چلا۔“

”آپ ہمیں وہاں شرکت کرنے سے روک

”حد ہو گئی۔ آپ بھی گالیاں دیتے ہیں انکل۔“ اشتادجہ نے جڑا سا منہ بتایا۔

”دیکھا جائے گا۔ اس دعوت میں ایسی کون سی بات ہے

”اوہ۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”تم لوگوں کے شرکت کرنے سے اشتادجہ کو نقصان ہو جائے

”معاف کیا۔ ہم معاف کرنے میں بہت شیریں ہیں۔ اور بھی

”شوق سے شرکت کریں۔ جیرال بولا۔

”دو چار معافیوں کی اگر ضرورت ہو تو وہ بھی لے لیں۔ آفتاب مسکرایا۔“

”آپ ہمیں اگر روکنا چاہیں۔ تو پولیس بلا سکتے ہیں۔ یا اپنے

”سٹر جیرال ٹاپ اگرچہ اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب

”لوگوں کے زور پر روکنا چاہیں تو ہم دو دو ہاتھ کرنے کے

”رہے ہیں، لیکن ہمارے سچے بھائیوں نے اس آگ پر ایک

”تیار نہیں۔“

”میں گھر آئے مہمانوں کو گرفتار نہیں کروں گا۔“

بردار نہیں کروں گا۔

ابھی بات ہے۔ آج ہم آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں، ابھی ہم آپ کو دعوت کھلا دیں گے۔ انیکٹر جمشد نے سرسری انداز میں کہا۔

ان کے ساتھیوں نے یہ الفاظ حیرت زدہ انداز میں سنے، ایک دشمن کے ہاں کھانے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں تھے، لیکن آج وہ خود کہہ رہے تھے کہ دعوت قبول کرتے ہیں۔ ان کے چہروں پر حیرت دیکھ کر وہ بولے : کوئی بات نہیں بھئی۔ آپ سب کھانا کھائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔

کھانا کھا کر انھوں نے جیرال کی طرف دیکھا، الوداعی انداز میں ہاتھ ملاتے اور باہر نکل آئے۔ اسی وقت جیرال دائرہ لیس پر جھک گیا اور ہدایات دینے لگا : سنو : انیکٹر جمشد اور ان کے ساتھی اس وقت میرے گھر سے نکلے ہیں۔ ان کی نگرانی کرو۔ وہ نظروں سے اوجھل ہونے پائیں۔

اد کے سر۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ٹھیکہ پندرہ منٹ بعد اس نے پھر دائرہ لیس پر رابطہ کیا :

دیے کی منصوبہ لے کر آئے ہیں؟ اس نے سرسری انداز میں کہا : آپ کو اس وقت پتا لگے گا جب ہم کامیاب ہوں گے۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔ جیرال نے بُرا سامنہ بنایا۔“ اور اگر ایسا ہو گیا تو؟

”تو میں آپ لوگوں کو باعزت طور پر یہاں سے رخصت کر دیتا ہوں۔“

جائے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اگر آپ یہ وعدہ نہ کریں تو بھی ہم باعزت طور پر یہاں سے رخصت ہوں گے۔“ چلو یہ بھی دیکھ لیں گے۔“

اتنے میں ملازم کھانا لے آیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا :

”گھرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کھانے میں زہر نہیں ہے۔“ اگر آپ لوگوں کو یہاں ختم کرنا ہوتا تو یہ میرے لیے ذرا مشکل نہیں تھا۔“

”خام خیالی ہے آپ کی۔“ اس وقت آپ لوگوں کو چیلنج کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ ورنہ اسی وقت فیصلہ ہو جاتا۔ آپ جب میرے گھر کی حدود سے نکل نہیں جاتے۔ میں آپ لوگوں



"ہاں! کیا رپورٹ ہے۔ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟  
 "وہ۔ ہمیں افسوس ہے سر۔  
 "افسوس ہے۔ کیا مطلب؟  
 "وہ ہمیں چکر دے گئے۔ ادا اب ہم نہیں جانتے۔  
 کہاں ہیں۔"

"کیا!!! خیر۔ اب مجھے خود گھر سے باہر نکلنا ہو گا۔  
 یہ کڑ کر حیرال آٹھ کھڑا ہوا۔"

خط

کونسل ہال میں مہمانوں کی آمد شروع تھی۔ حیرال اس ہال  
 کے دروازے کی خود نگہبانی کر رہا تھا۔ اس نے صرف ایک  
 دروازہ کھلویا تھا۔ ہر آنے والے کو وہ خود بغور دیکھ رہا  
 تھا۔ آخر تمام مہمان آگئے اور اس نے دروازہ بند کروا دیا،  
 ساتھ ہی اس نے حکم دیا :  
 "اب کوئی بھی اندر نہیں آئے گا۔  
 اوکے سر۔"

وہ اندر کی طرف چل پڑا۔ اچانک اس کی نظر راہداری  
 کے فرش پر پڑی۔ وہ بہت زور سے اُچھلا۔ کیچڑ میں بھرے  
 ہوئے ایک جوتے کا نشان فرش پر موجود تھا۔ اس کی  
 آنکھوں میں حیرت کے دیے جل اُٹھے :  
 "حیرت ہے۔۔۔ یہ لوگ تو اندر موجود ہیں۔۔۔ بھئی واہ۔  
 کمال ہے۔"

مکس نے دیا؟

مہمانوں میں شریک ایک مہمان نے دیا ہے سر۔

یہی تم اسے پہچان لو گے؟

نہیں سر۔ میں اسے صرف ایک نظر دیکھ سکا۔ پس وہ

لفافہ دے کر آگے بڑھ گیا تھا۔ لفافے پر چونکہ آپ کا

نام ہے، انداز میں نے یہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔

یہ آگے بڑھ گیا تو اس نے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک

پٹا سا پرچہ موجود تھا، اس پر لکھا تھا:

میکس انکل جیرال!

ہر مکس نا ساری چالاکی ہوا۔ نکل گئی نا ساری اکڑ

فوں۔ بڑے چالاک بنے ہیں۔ چلیے اس دعوت میں

ہمیں تلاش اسی کر کے دکھا دیں۔ مان جائیں گے آپ کو۔

آپ کا بھتیجا: قانون احمد

جیرال کا سر گھوم گیا۔ اس کے لیے سب کچھ محدود ہے

اب تھا۔ اول تو ان لوگوں کے اس ہال میں آنے کے اس

کلمات نہیں چھوڑے تھے۔ دوسرے یہ کہ اندر جوتے کا

نہ دیکھ کر اس نے ہال میں موجود تمام لوگوں کے چہروں

پر نظر دیکھا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا کہ جن لوگوں کے چہرے

اب اس نے تمام مہمانوں کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ اور

دعوت شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھانے پینے اور گیس لٹکنے میں

مصرف تھے۔ اور جیرال ان لوگوں کو تلاش کر رہا تھا۔

نے ایک ایک مہمان اور مہمانوں کے ساتھ آتے ہوئے پتہ

کو خود سے دیکھ ڈالا۔ لیکن وہ لوگ اسے کہیں بھی نظر

آئے۔ اچانک اسے کھانا تیار کرنے والوں کا خیال آیا۔

وہ اس طرف پلکا۔ کھانا تیار کرنے والوں کو اس

غور سے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس

پارٹی کا آدمی نظر نہ آیا۔ اب اس کا خیال سامان لانے

والوں کی طرف گیا۔ ان کی گاڑیاں عمارت سے باہر کھڑی تھیں

وہ دروازے پر پہنچا۔

”دروازہ بند کروا دینے کے بعد تو کوئی نہیں آیا؟“

”جی نہیں۔“

اب دروازہ کھلوا کر وہ ان گاڑیوں کی طرف آیا۔ ان میں

متعلقہ لوگ بیٹھے ادنگھ رہے تھے۔ وہ ان سب کو باری باری

دیکھنے لگا۔ آخر تک مار کر واپس پلٹا۔ ایسے میں ایک

نے اسے ایک لفافہ دیا:

”یہ کیا ہے؟“

”آپ کے نام ایک خط ہے سر۔“



اس نے دیکھے تھے، ان میں سے انپکٹر جینڈ یا ان کے کسی  
کا چہرہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر آخر یہ لوگ کہاں تھے  
اور کیسے اندر داخل ہوئے تھے۔

”شاید میں نیا ہوں۔ ابھی پوری طرح انہیں سمجھنے کا  
قابل نہیں ہوا۔ وہ بڑبڑایا۔

پھر مہمانوں کی واپسی شروع ہوئی، وہ ایک ایک چہرہ  
کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ سب لوگ رخصت ہو  
گئے۔ اب ہال خالی ہو چکا تھا۔ صرف عملے کے لوگ  
باقی تھے۔ اس نے عملے کے لوگوں کو بھی بغور دیکھا۔

کے سب لوگ اصلی تھے۔ اس نے ایک بار پھر پوری عمارت میں  
کا جائزہ لیا۔ اب وہاں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے  
عمارت کے تمام دروازے باہر سے بند کر دیئے اور خود عمارت  
کے اندر رہ گیا۔ اس وقت اس نے قدم سے بلند آواز میں

کہا :  
”تم لوگ کہاں ہو دو۔ میں تمہیں مان گیا۔ سامنے آ جاؤ۔  
میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تمہیں جانے سے روکوں گا۔  
اور اگر تم ملک سے نکل جانا چاہو تو بھی نہیں روکوں گا۔  
صرف اس صودت میں دوکوں گا۔ اگر تم لوگ انشارجہ کو کوئی  
نقصان پہنچاؤ گے۔“

”ابھی بات ہے۔“ جیرال نے جل کر کہا۔  
”دیکھیے انکل جیرال جلتے بھجنے سے آدمی کسی کام کا نہیں رہ  
سکتا۔ ہم چاہتے ہیں۔ آپ ہم سے شکست کھانے  
کے کسی کام کے ضرور رہیں۔“

”آپ آنکھیں بند کر لیں۔ ہم آپ کے سامنے آ جائیں گے۔  
”آپ کی چمکتی آواز سنائی دی۔“

وہ زور سے اُچھلا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ اب ہال  
میں موجود نہیں ہوں گے۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔  
ایسے نہیں انکل جیرال۔ آنکھیں پوری طرح بند کریں۔ آپ  
نے پوری طرح آنکھیں بند نہیں کیں۔ آپ یوں کریں۔ اپنا چہرہ  
دوسری طرف کر لیں۔“

”میں منہ دوسری طرف کر رہا ہوں۔ تم لوگ سامنے آ جاؤ،  
بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا، پھر ایک منٹ

”او کے“ جیرال ہنسا۔

پھر ایک منٹ اور گزر گیا تو انیکٹر حمید نے کہا :

”اب آپ اس طرف گھوم سکتے ہیں۔“

جیرال گھوما تو سب لوگ اس کے سامنے تھے۔ اس کی

آنکھوں میں حیرت ہی حیرت نظر آئی :

”آخر آپ لوگ کیا چیز ہیں۔ آپ ہال میں داخل کس طرف ہیں

ہوئے اور چھپے ہوئے کہاں تھے؟“

”اس سوال کا جواب آپ کو خود تلاش کرنا ہو گا۔ دیے گئے انیسٹریکشن کو انھوں نے یہ غملہ بھیجا ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔

جواب بہت آسان ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم نے اس ہال میں ٹھہرے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

میں داخل ہو کر صرف دعوت نہیں اڑائی ، بلکہ کچھ کام بھی کر رہا تھا۔ لیکن اگر ان لوگوں نے آپ کی بات نہ

کیا ہے۔“

”کیسا کام کیا ہے؟“

”یہ ہم کیوں بتائیں۔ اب آپ وعدے کے مطابق ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔“ انیکٹر کامران مرزا بولے۔

”اوہ ہاں ! ضرور کیوں نہیں۔“ اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔ یہ لوگ فرار نہیں ہو سکتے۔ ہم دروازہ کھول کر

عین اس وقت عمارت سے باہر بے شمار گاڑیاں رکھ کر آ رہے ہیں۔“

کی آواز سنائی دی۔ جیرال کے چہرے پر ایک دنگ آ کر جیرال نے پیک کر دروازہ اندر سے بند کر دیا ، پھر دوڑ

گزر گیا۔

”تو آپ نے دھوکا کیا جنکل ایرال۔“ فاروق نے نفرت سے

کہا۔ ”ادھر دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا

کیا سر۔ دروازہ اندر سے بند کس طرح ہو گیا۔ کیا



## عمارت

اس نے ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز چلا  
اس جگہ پہنچا جہاں انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اسے ایک جھٹکا لگا  
دہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کا سر ایک بار پھر گھوم گیا  
اسے ایک کاغذ پڑا دکھائی دیا۔ اس پر جلدی میں یہ لکھا  
لکھ گئے تھے :

انکل جیرال !

اب شاید آپ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکیں۔ انشورج کی  
پولیس، ہمیں کیوں فرار ہونے دے گی بھلا۔ اس لیے ہم اپنی شناخت کراؤ۔

اسی راستے سے واپس جا رہے ہیں۔ جس راستے سے  
آئے تھے۔ اگر آپ کوشش کریں تو وہ راستہ تلاش کر لیں گے۔

لیں گے، کیونکہ ہر انسان کو اس کی کوشش کا پھل ملنا چاہیے۔  
میتا ہے۔ اب یہ پتا نہیں۔ کہ صبر کے پھل کی طرح جیتا ہے۔

کوشش کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر ملیں گے دروازہ کھل رہے ہیں۔

گے۔

فاروق وغیرہ۔

الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

کا شکر ہے۔ آپ سب لوگ یہاں بخیریت نظر آ  
دور ہم لوگ ڈر رہے تھے کہ آپ لوگ کونسل ہاں

نے۔ تاکہ میرے دوست پروفیسر بگلر۔ آپ یہیں آجائیں۔

ان دنوں میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔ لہذا آپ گاڑی ہوٹل میں

بھیجیں گے۔ وہاں پروفیسر داؤد میک آپ میں موجود ہوں گے،

اور انور گاڑی لے کر وہاں جائے گا اور پروفیسر صاحب کو آپ

میک پہنچا دے گا۔ اس طرح ہمارے منصوبے کا ایک

مختصر پوری طرح کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری طرف آپ

کے بانی ساتھی جیرال کو اُلجھائے رکھیں گے، کیونکہ اس

انتظام کو یہاں کیا گیا ہے کہ جیرال آپ کا سراغ لگاتا

اس زمین دونوں ہوٹل تک پہنچ جائے۔ جب وہ آپ تک

پہنچے گا۔ آپ اسے اُلجھائیں گے۔ اس وقت تک جب

اس کی یہ دونوں ساتھی نہیں آجائے۔ پھر ہمارا کام

سہان ہو گا۔

بہت خوب! اس طرح ہم اپنے ملک کے اسلحے کے

بازار کی تباہی کا انتقام لے سکیں گے اور جیرال کو بھی

اپنا سبق سکھا سکیں گے۔ انپیکٹر کا مرزا بولے۔

لیکن یہ اس قدر آسان نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ جیرال

ہر جگہ امکانی احتیاطیں کر رکھی ہیں۔ وہ یہ اندازے

کی گناہ چکا ہے کہ آپ کیا کیا منصوبے لے کر آ سکتے

ہیں۔ یہاں نہیں آ سکیں گے۔

”جن لوگوں کے پاس آپ لوگوں جیسے جاننا موجود ہیں

ان کے لیے ایسی جگہوں سے نکل کر کیا مشکل ہے

انپیکٹر جمشید مسکراتے۔

یہ بتائیں۔ کیا رپورٹ ہے؟

”ایم برٹن کو آج رات اپنے گھر جاتے ہوئے گرفتار کر لیا

جائے گا۔ ان کے میک آپ میں آپ اسی گاڑی میں

سوار ہو جائیں گے۔ ڈرائیور کی جگہ ہمارا ایک آدمی

گا۔ وہ سڑکوں سے پوری طرح واقف ہے۔ ایم برٹن

اور ڈرائیور کے کفایت بھی نکال لیے جائیں گے، تاکہ

راتے میں کوئی بدیشائی نہ ہو۔ ایم برٹن کی جگہ آپ

اس کے گھر گزاریں گے۔ ایم برٹن کی آواز اور انداز و اطوار

کی نقل آپ پہلے ہی کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

ایک رات گزار ہی لیں گے۔ صبح سویرے آپ کو آپ

منزل پر پہنچا دیا جائے گا۔

”لیکن میں کیا کر سکوں گا۔ وہاں تو پروفیسر داؤد صاحب

کی ضرورت ہو گی۔

”پروفیسر صاحب کو آپ وہاں بلوائیں گے۔ فرزا صاحب

ترکیب کے مطابق آپ کو ایک فون ملے گا۔ آپ چلا آئیں



”خیر۔ دیکھا جائے گا۔ بظاہر تو ہمارے منصوبے میں کوئی رکاوٹ پڑتی نظر نہیں آتی۔“

”پروفیسر ایم برٹن کے دوست کی آمد اسے ضرور چونکا گی۔ ایک نے کہا۔“

”لیکن کیسے؟“

”تمام اہم جگہوں کے فون ٹیپ کیے جا رہے ہیں۔“  
”اوہ! وہ چونک اٹھے۔“

پھر ہر کوئی سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر شوکی نے کہا:  
”یہ واقعی ہمارا کمزور پہلو ہے۔“

”فرزانہ۔ فرحت اور رفعت اس پہلو کی کمزوری دور کرنے کی کوئی ترکیب سوچ سکتی ہیں۔“  
”ہم کوشش ضرور کر سکتی ہیں۔“

”تو پھر شروع کر دو کوشش۔ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، کہیں کسی کو کوئی شک نہ ہو جائے! انپکٹر جمشید نے ان دو آدمیوں سے کہا جو یہ اطلاعات لے کر آئے تھے۔ یہ انشادہ میں ان کی حفیہ فوس کے آدمی تھے۔“

وہ اسی وقت وہاں سے چلے گئے۔ ادھر وہ تینوں تو سوچ میں ڈوبی ہی تھیں، باقی لوگ بھی سوچنے لگے۔ پھر فرحت کی آواز ابھری:

”میرے ذہن میں اس پہلو کی کمزوری دور کرنے کی ایک ترکیب آئی ہے۔“  
”اور وہ کیا؟“

”جب صبح پروفیسر صاحب کو ان کے دفتر کی طرف لے جایا جائے تو راستے میں انکل کی جگہ پروفیسر انکل لے لیں۔ انہیں بھی آج رات ایم برٹن بنا دیا جائے۔“

”لیکن اس طرح تو صرف پروفیسر صاحب دہاں پہنچ سکیں گے اور اکیلے یہ گھبرائیں گے۔“ انپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا، پھر بولے: ”دہاں انپکٹر جمشید کا ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔“

”تب پھر اس پہلو کی کمزوری کیسے دور کی جائے؟“  
”میں کچھ عرض کروں۔ ایسے میں رفعت کی آواز سنائی دی۔ ضرور کیوں نہیں۔ جلدی کہو۔“

”دہاں فون نہ کیا جائے۔ پروفیسر انکل میک آپ میں ہی جگہ خود پہنچ جائیں۔ ایک ٹیکسی میں۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی حفیہ فوس کا ہو گا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر انکل کا مدد کر سکے۔ یہ دہاں جا کر پروفیسر صاحب کو پیغام بھیجیں۔ کہ ان کے دوست آئے ہیں؛ چنانچہ یہ انہیں بلا لیں گے۔“

”لیکن اس طرح بھی باہر کھڑے نگرانوں کے کان ضرور

کھڑے ہوں گے۔ کیونکہ اس سے پہلے تو پروفیسر صاحب کوئی دوست و ملاں آیا نہ گیا۔

”اس میں شک نہیں کہ رفعت کی ترکیب لا جواب ہے اور پہلی ترکیب کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل ہے۔“  
اس بات کا زبردست امکان ہے کہ باہر کھڑے نگوان جیرال کو خبر کر دیں گے کہ پروفیسر ایم برٹن سے ان کا کوئی دوست ملنے آیا ہے۔

”تب پھر کیا کیا جائے؟“  
”رفعت کی ترکیب پر عمل کیا جائے، لیکن ہمیں اگلے قدم کے بارے میں پہلے سے سوچ لینا چاہیے۔ یعنی اگر وہاں جیرال کو بلا لیا گیا تو؟“ فرزانہ بولی۔

”اس صورت میں انیکٹر جمشید میدان میں آجائیں گے۔ پروفیسر صاحب کو اپنا کام کرنے کا موقع دیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم بھی ان سے دُور نہیں ہوں گے۔ وقت پڑنے پر میدان میں کود جائیں گے۔“

”بالکل ٹھیک۔ تو پھر اللہ کا نام لیں اور آبا جان آپ اپنے ماتحتوں کو کیس کی اس تبدیلی سے آگاہ کر دیں۔“

انیکٹر جمشید نے باہر جا کر خفیہ الفاظ میں فون کیا اور واپس آ گئے۔ اب انیکٹر جمشید کے چہرے پر انیکٹر کامران

مرزا نے ایم برٹن کا میک اپ شروع کیا۔ وہ سب دیکھتے رہے۔ آخر چار گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد انہیں ایم برٹن بیٹھا نظر آنے لگا۔

اور پھر پردگرام کے مطابق وہ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں ایم برٹن کی گاڑی کو روکا جانا تھا۔ ایم برٹن چونکہ شہر سے باہر بیٹھا تھا۔ اس لیے یہ جگہ قدرے سناں تھی۔ اور چند منٹ کے لیے انہیں موقع مل سکتا تھا؛ تاہم اس بات کا امکان موجود تھا کہ جونہی وہ اپنا کام کریں۔ ادھر سے یا ادھر سے کوئی گاڑی آ جائے۔ اور اس خطرے سے بچنے کے لیے ان کے باقی ساتھی بالکل تیار تھے۔

اللہ اللہ کر کے پروفیسر ایم برٹن کی گاڑی دکھائی دی۔

”تیار! انیکٹر جمشید بولے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔ سارا کام ہم خود کریں گے۔ آپ سب لوگ درختوں کی اوٹ میں رہیں گے۔ خفیہ فورس کے انچارج نے کہا۔“

اسی وقت پروفیسر کی گاڑی نزدیک آ گئی۔ ایک بے آواز غار ہوا اور ٹائر پنکچر ہونے کی آواز گونجی۔ ساتھ ہی پروفیسر ایم برٹن کی جھلکی ہوئی آواز گونجی:

”خدا ہو گئی۔ ٹائر پنکچر ہو گیا۔ بالکل نیا تھا۔“



"کوئی بات نہیں سر۔ میں ابھی تین منٹ میں ٹائر تبدیل کیے دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ ساتھ ہی اس کے سر پر کوئی چیز لگی۔ وہ تہورا کر گرا۔

"ارے ارے۔ کیا ہوا بھی؟ ایم برٹن کے منہ سے نکلا۔" دائیں طرف سے ایک گاڑی آ رہی ہے۔" رفعت نے بائیں لوگوں کو ہوشیار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم اوٹ میں رہیں گے۔" انپکٹر جمشید بوسے "لیکن اتنی دیر میں آپ پروفیسر کی جگہ تو لے سکتے ہیں؟" "اوہ ہاں! یہ ٹھیک دہے گا۔"

یہ کہتے ہی وہ بلا کی رفتار سے حرکت میں آئے۔ کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ایم برٹن کی نظر جونہی ان کے چہرے پر پڑی۔ وہ دھک سے رہ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے سر پر انپکٹر جمشید کا ایک ہاتھ لگا اور وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا۔ انپکٹر کامران مرزا پہلے ہی تیار تھے۔ انھوں نے فوراً اسے گھسیٹ لیا۔ اب انپکٹر جمشید دوسرے دروازے سے باہر نکلے اور ڈرائیور پر جھک گئے۔ عین اس وقت سامنے سے آنے والی کار نزدیک آ کر رک گئی۔

"کیا بات ہے جناب۔ ارے یہ تو پروفیسر برٹن ہیں۔"

ہوا سر؟

"ٹائر پنچر ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نیچے اتر رہا تھا کہ پتا نہیں، اسے کیا ہو گیا۔ شاید جکر آ گیا ہے۔ لگتا ہے، بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"کیا ہم مدد کر سکتے ہیں؟"

"ہاں! پنچر لگانے میں میری مدد کر دیں۔ گاڑی تو میں بھی چلا لوں گا۔ اسے پچھلی سیٹ پر لٹا دیتے ہیں۔ گھر جا کر ڈاکٹر کو فون کر دوں گا۔"

"اوہ ہاں! ٹھیک ہے۔ ہم ضرور پنچر لگانے میں مدد کریں گے۔" اور پھر پنچر لگایا گیا۔ ڈرائیور کو پہلے ہی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔" پروفیسر نے کار والوں سے کہا۔

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ بائی بائی۔"

کار والے ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ اب انپکٹر جمشید اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جونہی وہ کار نظروں سے اوجھل ہوئی۔

ڈرائیور کو گھسیٹ لیا گیا۔ اور اس کی جگہ پچھلی سیٹ پر اس کے میک آپ میں خفیہ فون کا آدمی لیٹ گیا۔ بے ہوش بن کر،

"خدا حافظ!" انپکٹر جمشید نے دہی آواز میں کہا اور آگے بڑھ گئے۔

"میری خواہش ہے۔ جیرال کو ہمدے پردگرم کی بالکل خبر نہ ہو۔ جس طرح ہمیں اس کے پردگرم کی خبر نہ ہو سکی۔ ہم سب کی کوشش تو یہی ہے سر۔ باقی جو اللہ کو منظور۔ اور میں کہتا ہوں۔ اگر اسے خبر ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہمدے راستے میں آ جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو کیا اس کی نسبت بڑی کامیابی ہم حاصل نہیں کریں گے سر؟"

"بہت خوب نمبر۔ مان گیا میں تمہیں۔ تمہاری اس بات میں بہت وزن ہے۔ میرا خیال ہے۔ ہم بس پہنچنے والے ہیں۔"

ان کی نظریں دود سے نظر آنے والی عمارت پر جم گئیں۔

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

KHAN STATIONERS &  
GENERAL STORE  
Shop F/890, Bhabra Bazar,  
Nishtar Road, Rawalpindi.

تھوڑی دیر بعد وہ بھی پردیسراہم برٹن کی کوٹھی کا سر پر دہے تھے۔ تمام رات کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ صبح اپنے سر پر پردیسراہم برٹن کی کار کوٹھی سے نکلی اور روانہ ہوئی۔ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے سر پر بیٹی بندھی تھی۔ "تمہارے سر پر کل جوٹ لگ گئی تھی۔ سر میں شہد ہے۔ لہذا تم بات چیت کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں اپنے کہیں میں جا کر لیٹ جانا۔ کوئی بات کرنا چاہے سر میں شدید درد کا اشارہ کر کے خاموش رہنا۔" لیکن سر میں ڈرائیور کے لہجے میں بات کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سے کئی بار ملاقات کی ہے۔ مختلف ایک میں؟ اس نے کہا۔

"اس کے باوجود احتیاط بہتر ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔"

"کوئی خطرہ ہوا تو تمہاری جیب میں موجود چیونگم آواز دینے لگے گا۔ پردیسر صاحب کا تیار کردہ چیونگم بہت کام کی چیز ہے۔ اگر کوئی دشمن تلاشی لے۔ اور چیونگم چبا ڈالے تو وہ سو فیصد چیونگم ثابت ہو گا۔ انھوں نے اسے بتایا۔" ٹھیک ہے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہر کام پردگرم کے عین مطابق ہو گا۔"



اس سے یہ ہوتا ہے کہ ان کی گھڑی چند سیکنڈ پیچھے نظر آنے لگی تھی مجھے۔ میں نے سوچا، اس طرح پروگرام میں چند سیکنڈ کا فرق بڑ جائے گا اور اس قسم کے پروگراموں میں چند سیکنڈ کا فرق بھی حد درجے خطرناک ہوتا ہے۔ کیوں جی آصف۔ تمہارا کیا خیال ہے؟  
 "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آصف بولا۔

کیا کیسے ہو سکتا ہے؟  
 یہ کہ انکل کی گھڑی چند سیکنڈ پیچھے ہو، جبکہ ہم سب نے اس پروگرام کو شروع کرتے وقت اپنی گھڑیاں آپس میں ملا لی تھیں۔"

"اوپر ہاں واقعی۔ یہ بات تو چونکا دینے والی ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ گھڑی چند سیکنڈ پیچھے ہو جائے۔ ہماری گھڑیاں کوئی معمولی گھڑیاں تو ہیں نہیں۔"  
 اسی وقت انکسٹرکامران مرزا آتے دکھائی دیے۔ ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

خیر تو ہے انکل؟  
 معلوم ہوتا ہے۔ اس زمین دوز ہوٹل میں ہماری موجودگی کی سن گن جیروال کو ہو گئی ہے۔  
 یہ بات آپ کیسے کر سکتے ہیں؟

## چند سیکنڈ کا فرق

"ابا جان کے پہنچنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ پروگرام مطابق ایک منٹ بعد ہمیں نکل جانا چاہیے۔ محمود نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ ابھی یہیں ٹھہرو۔ میں ہوٹل سے باہر جا کر ایک نظر ادھر ادھر ڈال لوں، تاکہ اطمینان ہو جائے۔" بہت بہتر انکل۔ فرزانہ نے فودا کہا۔

پھر جونہی انکسٹرکامران مرزا کمرے سے نکلے۔ فرزانہ بولی:

تم انکل سے بڑے کب سے بن گئے۔ کیا انہیں نہیں معلوم تھا کہ دس منٹ رہ گئے ہیں اور اب ہمیں حرکت میں آنا ہے۔ معلوم تھا۔ لیکن میری نظر ان کی گھڑی پر پڑ گئی تھی۔ محمود مسکرایا۔

"تب پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟

”ایسے کہ باہر ملٹری نظر آ رہی ہے۔“

”تب پھر کیا کرنا چاہیے؟“

”باہر صرف خان رحمان جائیں گے، آخر یہ ایک فوجی ہے۔“

”لیکن اگر فوجیوں نے مجھے روک لیا تو میں کیا کروں؟“

خان رحمان نے کہا۔

”یہ کہ تم شاد جستان کے رہنے والے ہو۔ اور انٹرنیٹ پر“

سیر کرنے کے لیے آئے ہو۔ پھر وہ تم سے کال کرے گا۔“

طلب کریں گے۔ اگر کاغذات چیک کرنے کے بعد“

نے تمہیں جانے دیا تو پھر ہم بھی آ جائیں گے۔“

”لیکن اس طرح وقت کی پابندی کیسے رہ جائے گی؟“

رحمان نے الجھن کے عالم میں کہا۔

”وہ میں یہاں سے نکلنے کے بعد کر لوں گا۔“

”ابھی بات ہے۔ آپ لوگ ایسی جگہ پہنچ جائیں۔ جہاں“

سے مجھے دیکھ سکیں۔“ خان رحمان بولے۔

”بالکل ٹھیک۔ آؤ بھئی چلیں۔“

وہ ہوٹل میں ایسی جگہ آ گئے۔ جہاں سے باہر“

والی کارروائی کو دیکھ سکتے تھے۔ خان رحمان اس وقت“

ہوٹل سے باہر جا چکے تھے۔ وہ ٹہلنے کے انداز“

چلے جا رہے تھے۔ ایسے میں ادھر محمود نے کہا:

”انکل! ایک عجیب بات اور۔ آپ کی گھڑی چنڈیکنڈ ٹیپھے“

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انھوں نے خوف زدہ“

آواز میں کہا، پھر فوراً اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ باقی سب“

کی گھڑیوں کی طرف دیکھا۔ اور ان کا رنگ زرد پڑ گیا:

”افسوس! یہ بات تم نے خان رحمان کے جانے سے پہلے“

”کیوں نہ بتائی؟“

”کیوں انکل۔ اس سے کیا فرق پڑ گیا؟“

”بہت فرق پڑ گیا۔ ہوٹل میں جیرال کا کوئی کارندہ موجود“

ہے۔ یہ کام اس نے اس وقت دکھایا ہوگا، جب میں نے“

گھڑی اُتار کر تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔“

”اوہ! لیکن اس بات سے انکل خان رحمان کو کیا خطرہ ہو“

سکتا ہے؟“

”وہ۔۔۔ وہ تو اس وقت تک۔۔۔“

ان کی نظریں باہر جم گئیں۔ خان رحمان کو ایک گاڑی“

میں بٹھایا جا چکا تھا، پھر بھاری قدموں کی آوازیں سنائی“

دیں۔ انھیں اپنے چاروں طرف ملٹری والے نظر آنے“

لگے۔ ان کی رائفلوں کے رُخ ان کی طرف تھے۔

”ان کی گنتی کر دو۔ ان میں سے ایک نے کہا۔“



انہیں گنا گیا :

" ایک کم ہے سر "

" ایک کہاں ہے ؟ "

بے ہی تاڑ چکے تھے اور دروازہ کھول کر دیکھ چکے تھے ۔

لہذا اس وقت انہیں ذرا بھی دقت نہ ہوئی ۔ جلد ہی وہ

ہال کے پچھلی طرف سرک پر تھے ۔ انسپکٹر کامران مرزا

نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کر دیا ،

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی وہ بولے :

برٹن روڈ "

اد کے " ڈرائیور نے کہا ، پھر اس کے ہونٹ ہلے ۔

ہونٹوں کی حرکت کو دیکھ کر وہ چونکے ، اس کی طرف دیکھ

کر انہوں نے کہا :

" سلمان لگتے ہیں ؟ "

آپ نے کیسے جانا ؟ اس کے لہجے میں حیرت تھی ۔

آپ کے ہونٹوں کی حرکت سے ۔ گاڑی شارٹ کرتے

وقت اللہ کہا ہے آپ نے " وہ مسکرائے ۔

اوپر ہاں بالکل ٹھیک " اس نے کہا ۔

یہ خوشی کی بات ہے میرے لیے ۔ میں چاہتا ہوں ۔

اس نے کہا ۔ بلکہ بہت تیز "

تیز کیا ہے ؟

انشاریہ نے ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے ۔

کے اسلحے کے ڈپو میں آگ لگنے کا واقعہ اخبارات میں پڑھا

وہ خوش ہو گئے ۔ اس کا مطلب تھا ، کم از کم انہیں

انسپکٹر جمشید کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا ، لیکن ساتھ

یہ سوچ کر ان کے دل بیٹھ گئے کہ پروفیسر داؤد اب ان

ملک کیسے پہنچ سکیں گے ۔ اسپر کامران مرزا کا ذہن اس

وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ

طرح پروفیسر داؤد انسپکٹر جمشید تک پہنچ جائیں ۔

" بولو ۔ تمہارا ساتھی کہاں ہے ؟ "

" یہ بات تم ہم سے معلوم نہیں کر سکو گے " انہوں نے

مسکرا کر کہا ۔

اچانک ایک ہلکا سا دھماکا ہوا ۔ کمرہ دھوئیں سے

بھر گیا ۔ ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا نے پروفیسر داؤد

ماتحت پکڑا اور باہر کی طرف چلے ۔ وہ سیدھے ہال میں آئے

ہال میں انہوں نے پچھلے دروازے کا رخ کیا ۔ اس نے کہا

ملٹری والے نہیں تھے ۔ شاید اس لیے کہ اس طرف

دروازے کو بند کر دیا گیا تھا ۔ لیکن اس کا معائنہ

ہی کر چکے تھے اور ایمر جنی کی صورت میں اس

ہو گا؟

”عجیب بزدل نکلا۔ اس سے تو بہتر تھا۔ ہم اس سے بات نہ کرتے۔“

”ہاں بالکل۔ تو پھر؟ اس نے حیران ہو کر کہا۔“

”اب ہم کسی ڈرائیور سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ اس وقت تک ہمیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

”ہم اس ملک کو اس سے بھی بڑا نقصان پہنچانے نیت سے آئے ہیں۔“

ایسے میں ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ انپکٹر کامران مرزا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، لیکن وہ آگے بڑھ گئی۔

”کیا! اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گاڑی سڑک پر اُدھر اُدھر لہرانے لگی۔ انپکٹر کامران مرزا گھبرا گئے۔ پروفیسر داؤد کا تو رنگ اڑ گیا۔“

تین چار ٹیکسیاں گزد گئیں۔ ان کی پریشانی بڑھ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے انھیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ وہ اس کے ذریعے برٹن روڈ پہنچے۔ وہ کافی لیٹ ہو چکے تھے۔ ابھی انھیں بیدل بھی چلنا تھا۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا؟“

”میں بھی آپ کے ساتھ خطرے میں گھر گیا۔“

اندر انپکٹر جمشید بہت پریشان ہوں گے۔ آپ فوراً جائیں اور ملاقات کی خواہش ظاہر کریں۔ میں اس پاس رہوں گا۔ عمارے ساتھی تو اس وقت تک حیران کے سامنے پہنچا دیے گئے ہوں گے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ اور مسلمان کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اگر آپ زیادہ گھبراہٹ محسوس کر رہے ہیں تو گاڑی روک لیں، ہم اُتر جاتے ہیں۔ اس طرح آپ خطرے میں نہیں رہیں گے۔“

”اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ اس نے فوراً گاڑی سڑک کے کنارے کر لی اور بولا:

”تو پھر ان کے لیے اب کیا کیا جائے؟“

جلدی سے اُتر جائیں۔“

”وہ آپ فکر نہ کریں۔ آپ صرف اپنا کام کریں۔“

”وہ نیچے اُتر آئے۔ اس نے گاڑی فوراً آگے بڑھا دی:

”خدا حافظ! وہ بولے اور آگے بڑھ گئے۔“

”ارے ارے۔ یہاں تک کا کرایہ تو لے لیں۔“

لیکن وہ کہاں رکنے والا تھا:



پروفیسر داؤد عمارت کی چار دیواری والے دروازے پر پہنچے۔ دروازے پر ملٹری کا پہرہ تھا :  
"میں پروفیسر ایم برٹن کا دوست ہوں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"آپ ان سے گھر ملاقات کر سکتے ہیں، یہاں نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے آج اچانک اپنے وطن جانا پڑ گیا ہے۔ پروفیسر صاحب کو مجھ سے کچھ کام تھا۔ انھوں نے ملنے کی ہدایت کی تھی۔ آج شام گھر پر ہماری ملاقات ہونا تھی۔"

"لیکن آپ یہاں تک آئے کیسے؟"

"ایک ٹیکسی کے ذریعے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ان اطراف میں کسی ٹیکسی کو آنے کی اجازت نہیں۔ لہذا وہ کچھ فاصلے پر آثار کر چلا گیا۔ پروفیسر داؤد کو یہی مجھے بتائے گئے تھے، لہذا انھوں نے روانی سے بول دیے۔"

"ہاں! اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم پروفیسر صاحب سے پوچھتے ہیں۔"

"پھر چند منٹ بعد ان سے کہا گیا :

"آپ کو پروفیسر صاحب نے اندر بلایا ہے۔ لیکن ایسا یہاں کی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا ہے۔"

کیا مطلب؟

"کسی ملاقاتی کو یہاں ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں اور یہ پابندی خود پروفیسر صاحب نے عاید کر رکھی ہے۔"

"میں نے بتایا نا۔ میں ان کا دوست ہوں۔ بچپن کا دوست۔ انھوں نے کہا۔ دل میں وہ خوش ہو رہے تھے۔"

چار دیواری کے اندر ایک گھٹنا باغ تھا۔ اس باغ کے یہاں میں سفید رنگ کی بہت بڑی عمارت تھی۔ اب وہ

اس عمارت کے دروازے پر پہنچے، پھر وہاں سے ایک نگران انہیں لے کر چلا۔ اندر انھیں عمارت میں کئی برآمدے ملے

کرنا پڑے۔ پھر لفٹ کے ذریعے اوپر والی منزل پر

پہنچے۔ آخر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی :

"کیا میرے بچپن کے دوست ہیں؟"

"ان بالکل! وہ فوراً بولے۔"

"آنے دیا جائے۔"

دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

ان کے ساتھ لائے والا آدمی واپس چلا گیا۔ ان کے اندر داخل

ہونے پر دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

اندر انیکٹر جمشید کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار

تھے۔ انھوں نے مقامی زبان میں چند ادھر ادھر کی باتیں

کیں، پھر اس ملاقات کے سلسلے میں باتیں کیں۔ اس دوران کاغذ پر لکھ رہے تھے :

پروفیسر صاحب۔ جلدی بتائیں۔ کیا ہوا۔ آپ وقت کیوں نہیں پہنچ سکے؟

پروفیسر داد نے جلدی جلدی مختصر طور پر حالات دیے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے لکھا :

”تب ہم بہت بڑے خطرے میں ہیں۔ آپ اپنا کام دیر میں کر سکتے ہیں؟“

”جس ایک ہی طریقہ ہے۔“ انھوں نے لکھا۔  
”اور وہ کیا؟“

”یہ کہ ہم اس عمارت میں غائب ہو جائیں۔ اور اپنا کام شروع کر دیں۔“

یعنی اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ان کے دل بہت زور سے دھڑکے۔

## جیرال زندہ ہے

وہ سب جیرال کے سامنے حاضر تھے۔ انھیں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ جیرال انھیں گن چکا تھا، دیکھ چکا تھا، لہذا اس نے طنزیہ انداز میں کہا :

”ایکٹر جمشید، ایکٹر کامران مرزا اور پروفیسر داد تم لوگوں میں سے ہیں۔ جلد بتا دو۔ وہ کہاں ہیں؟“

”افسوس! ہم ان کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“ فاروق کے منہ سے نکلا۔

”کیسے نہیں بتاؤ گے۔ مجھے زبان کھلوانا آتا ہے۔ مم۔ مم۔ مگر میں۔ اس طرح وقت ضائع ہو گا۔ اور میرے پاس

فون کرو۔ جلدی۔ جیرال نے پاس کھڑے ماتحت سے کہا۔

”اوکے سر۔ اس نے فون کیا۔ فوراً ہی ایم برٹن کے نمبر ملائے گئے اور دوسری طرف سے



ایم برٹن کی آواز سن کر بیک نے فون کا ریسیور جیرال کی طرف بڑھا دیا :

"ہیلو پروفیسر صاحب۔ جیرال بات کر رہا ہوں۔ ہاں سب خیریت تو ہے؟"

"ہاں مسٹر جیرال۔ بالکل۔" ایم برٹن کی آواز سنائی دی۔  
"شکریہ پروفیسر صاحب۔ بس یہی معلوم کرنا تھا۔ یہ کون جیرال نے ریسیور رکھ دیا۔"

اب اس نے ان سب کو بنور دیکھا، پھر سرسراہٹ آواز میں کہا :

"تو پروفیسر ایم برٹن کی جگہ وہاں انیکسٹر جمشید موجود ہیں۔ اور غالباً پروفیسر داؤد ان کے دوست کے روپ میں ان کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ ڈرائیور کی جگہ انیکسٹر کامران مرزا نے لی ہو گی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کچھ کہ نہیں سکتے۔" آصف نے گول مول انداز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کی کڑی نگرانی کر دیجیے۔ اگر یہ خراب ہو گئے تو پھر تھلادی زندگی ختم ہو جائے گی۔ جیرال نے سرد آواز میں کہا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔  
"نہیں۔ سر۔ جیکب نے کانپ کر کہا۔"

لیکن جیرال اس کا نہیں سننے کے لیے وہاں کب رکا تھا، وہ تو آندھی اور طوفان کی طرح باہر دوڑا جا رہا تھا۔ باہر اس کی کار بالکل تیار تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھ کر باہر کی سی تیزی سے کار چلاتا اس عمارت تک پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر باہر کھڑے ملٹری مین چونک کر سیدھے ہو گئے :

"پروفیسر ایم برٹن اندر ہیں؟"

"یس سر۔"

"ان کے ساتھ کون آیا تھا؟"

"وہ تو اکیلے آئے تھے۔ ہر روز کی طرح۔ لیکن ان کے ایک دوست ملنے آئے ہوئے ہیں۔"

"یہاں کوئی دوست ملنے نہیں آ سکتا۔ کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں؟"

"معلوم ہے، لیکن خود پروفیسر صاحب نے انہیں اندر پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔"

"اوہ اچھا۔ مجھے ان تک پہنچا دو۔ جلدی۔"

"آئیے سر۔"

وہ اندرونی دروازے کی طرف مڑے ہی تھے کہ جیرال کے سر سے کوئی چیز ٹکرائی۔ اس کا سر بہت زور سے چکرایا۔ اسے سر پکڑ کر بیٹھ جانا پڑا۔ چند سیکنڈ

تک وہ اس حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ تھوڑا اٹھا، لیکن پھر بیٹھ گیا۔ اس کا سر بہت دور سے چکرایا تھا۔ آخر اس نے مشکل سے کہا:

”ڈڈ۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جلدی۔“

پھر وہ زمین پر لیٹ گیا۔

”اے اے سر۔ آپ کو کیا ہو گیا؟“

پھر اسے اٹھا کر چار دیواری کے دروازے پر بنے کیبن میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر اندر عمارت میں موجود تھا۔ لہذا اس نے آنے میں خاص دیر نہ لگی۔ اس نے آکر جیرال کا معائنہ کیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا:

”لیٹے رہیے سر۔ ابھی آپ کوئی کام نہ کریں۔“

”بٹو۔ مجھے نہ روکو۔ ورنہ سب تباہ ہو جائے گا۔“

”سب تباہ ہو جائے گا۔ کیا تباہ ہو جائے گا؟“

جیرال نے اسے زور کا دھکا دیا، وہ کیبن سے باہر دور جاگوا۔ جیرال کیبن سے نکلا اور اندر کی طرف دیرا ہی تھا کہ پھر اس کے سر سے کوئی چیز آ کر کرائی۔

وہ ایک بار پھر گرا۔ اور مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا:

ڈاکٹر۔ انجکشن کیا ہو گیا۔ جلدی کریں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

اوہ ہاں۔ ابھی لیجیے۔

ڈاکٹر نے پھر اسے ایک انجکشن دیا، لیکن اس بار اس نے ذرا آنکھیں نہ کھولیں اور بدستور بے ہوش رہا:

اٹ۔ اب ہنم کیا کریں۔ کیا کرنل صاحب کو فون کریں؟

نگران نے کہا۔

میں پروفیسر صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ اس بہت حال کو سنبھال لیں گے۔ ایک نگران نے کہا اور اندر

لطف دوڑ لگا دی۔

○

دیسور رکھ کر انپکٹر جمشید اُن کی طرف مڑے:

خطرہ سر پر آ پہنچا۔ جیرال کا فون تھا۔ اسے اندازہ

کیا ہے کہ ہم یہاں آ گئے ہیں۔ لہذا اب فوراً حرکت

لانا آنے کا وقت ہے۔

جیک ہے۔ میں تیار ہوں۔



"میں پہلے نمبراً کو بلا لوں گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے اسے  
ذریعے نمبراً کو خبردار کیا۔ وہ فوراً پہنچ گیا :  
"کیا بات ہے سر؟"

"خطرہ۔ جیرال آ رہا ہے۔ تم برو فیئر صاحب  
کو اندر چلے جاؤ۔ یہ جلد از جلد اپنا کام کر کے باہر  
کی کوشش کریں۔ سمجھ گئے؟"  
"یس سر۔ اور آپ؟"

"میں جیرال کو روکنے کے لیے یہاں موجود رہوں گا۔  
کیونکہ جتنی دیر میں اسے روک سکوں۔ اتنا ہی اچھا ہے۔  
"تو کیا کام ہو جانے پر میں صرف انھیں لے  
بکسل جاؤں؟"

"ہاں! تم میری فکر نہ کرو۔ میری آ جاؤں گا۔"  
"او کے سر۔"

وہ فوراً کمرے سے نکل گئے۔ انپکٹر جمشید دھندلے  
کرتے دل کے ساتھ انھیں جاتے دیکھتے رہے۔  
جب وہ اندرونی حصے میں پہنچتے نظر آ گئے تو انھوں نے  
کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے  
ہوں گے کہ دروازے پر دھک ہوئی :  
"کون؟"

"یہ۔۔۔ میں ہوں سر۔ برونی دروازے کا ایک نگران۔  
جیرال صاحب آئے تھے۔ وہ آپ سے فوری ملنا چاہتے تھے  
لیکن وہ اچانک گر کر بے ہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر نے انھیں  
انکس دیا، وہ ہوش میں آئے، اٹھ کر چلنے لگے تو  
پھر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔"

ان کا ذہن فوری طور پر انپکٹر کامران مرزا کی طرف  
گیا۔ اس کا مطلب تھا، یہ کام انھوں نے دکھایا تھا، وہ  
سکراتے اور دروازہ کھول دیا :

"تو انھیں اٹھا کر یہاں لے آؤ۔ میرے پاس آلات  
دفیر یہاں ہیں۔ میں انھیں دیکھ لوں گا۔"  
"اچھی بات ہے۔ نگران نے کہا اور واپس ہڑ گیا۔"

وہ انتظار کرنے لگے۔ ساتھ ہی ان کی نظریں گھڑی پر  
پڑی تھیں۔ برو فیئر داؤد کو کچھ وقت درکار تھا۔ جیرال اگر  
یہاں نہ آ جاتا تو یہ وقت آسانی سے انھیں مل جاتا۔ لیکن  
اب جب کہ جیرال یہاں آ گیا تھا تو یہ وقت بہت مختصر کر  
پڑ گیا تھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ جیرال کو انپکٹر کامران  
مرزا نے بے ہوش کر دیا تھا۔ لیکن کب تک۔ اس کے  
بلد ہوش میں آنے کا امکان تھا۔ ادھر وہ چھوٹی پارٹی  
کے بارے میں فکر مند تھے۔

تین منٹ بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ انھوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ چار آدمی حیران اٹھائے اندر داخل ہوئے :

"یہاں لٹا دو۔ وہ بولے۔

انھوں نے اسے لٹا دیا :

"بس! اب تم جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔"

"او کے سر۔ وہ بولے اور چلے گئے۔

انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی کو اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ اب انھوں نے حیران کی نبض وغیرہ چیک کی۔ ایسے میں اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ انھوں نے جیب سے ریٹم کی ڈوری نکال کر اس کے پاؤں جکڑ دیے اور لٹھ بستر سے باندھ دیے۔ پڑے ہیں۔ اسی وقت اس نے آنکھیں کھول دیں۔

انپکٹر جمشید اس وقت رسیاں کس رہے تھے، انھوں نے رسی کے مزید بل دینا شروع کر دیے، تاکہ رسیاں پھٹ جائے گا۔ یہ رسی بھی پروفیسر دادد کے پاس تک پہنچا اور زور لگایا، لیکن رسی نہ ٹوٹی۔ اور زور لگایا، بنائی ہوئی تھی۔ اور اس کا توڑ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔

"بہت خوب جمشید۔ یہ کام کیا ہے تم نے؟"

"یہ کمرہ ہر طرح سے سائونڈ پروف ہے۔ اور اس

میں ہونے والی گفتگو کوئی اور کسی بھی صورت نہیں سن سکتا۔ انپکٹر جمشید نے گویا اسے اطلاع دی۔

"ہاں! میں یہ بات جانتا ہوں۔ لیکن میں بے ہوش کسی طرح ہو گیا تھا؟"

"ہو سکتا ہے۔ یہ کام میرے کسی ساتھی نے دکھایا ہو۔"

"مطلب یہ کہ باہر بھی کوئی ساتھی موجود ہے اور وہ ضرور انپکٹر کامران مرزا ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔ آپ کا خیال درست ہو۔ وہ مکرانے۔"

"صورت حال کیا ہے؟"

"یہ کہ آپ اس وقت اس بستر کے ساتھ رسیوں سے بندھے ہیں۔ ان رسیوں کی کیا حقیقت ہے۔ یہ ابھی توڑ دیتا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔ وہ بولے۔"

حیران نے زور لگایا۔ لیکن رسی نہ ٹوٹی۔ اور زور لگایا، لیکن رسی اپنی جگہ رہی۔ آخر اس نے زور لگایا۔ منہ کیا اور بولا :

"پروفیسر دادد کہاں ہیں؟"

"یہاں ہیں۔ اور اپنا کام کر رہے ہیں۔"

"اگر پروفیسر صاحب یہاں ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں تو



انہیں روک دیں۔ انپکٹر جمشید۔ انہیں روک دیں۔ یہ مہینہ آپ سے درخواست ہے۔ اس کے بدلے میں آپ جو کم گئے۔ انشارجہ کرے گا۔

”میں صرف اور صرف انشارجہ کے اس ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔“ انپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔ ان کا چہرہ تن گیا۔

”نہیں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ یہ پوری دُنیا میں سب سے عظیم نقصان ہوگا۔“

”میں کیوں پروا کروں۔ کیا آپ نے میرے ملک کے کے ذخیرے کو آگ لگاتے وقت احساس کیا تھا؟“ وہ انشارجہ کا حکم تھا۔ میں مجبور تھا۔

”آپ نے وہ آگ کس طرح لگائی۔ جلدی جلدی جواب دیں مسٹر جیرال۔ آپ کے پاس وقت بہت کم ہے اور آپ کے پاس آپ سے بھی کم۔ انہوں نے کہا۔“

”عابد جیلانی کی مدد سے۔ اسے اندر جانے سے روکنا نہیں روکا تھا۔ اور ان کے ساتھ ان کا ایک دوست گیا تھا۔ وہ دوست انشارجہ کا ایک سائنس دان تھا۔ اس نے اندر جا کر یہ کام کیا تھا۔“

”ادہ۔ اب آپ اپنے اس ایٹمی پلانٹ کے بارے میں اندر پروفیسر داؤد موجود ہیں۔ اور وہی کام کر رہے ہیں جو انشارجہ کے آدمی نے کیا تھا۔“

آپ کو پتا ہے۔ اس کا نتیجہ خود آپ کے لیے کس قدر خطرناک ہوگا۔ اس کو کیسے؟

انکاری اثرات پوری دُنیا کو لے بیٹھیں گے۔ پوری دُنیا کو نہیں، صرف انشارجہ کو لے بیٹھیں گے۔ اس واقعہ نے اس پہلو پر خوب غور کیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، پھر بولا:

”پچھتاوا کر لیں۔“

”کیسا سودا؟“

آپ کا یہ ایٹمی پلانٹ تباہ ہو کر رہے گا۔ میرا فیصلہ یہی ہے۔“

ہم آپ کو چار گنا اسلحہ دینے کے لیے تیار ہیں۔“  
اسلحہ گنا بھی نہیں۔ اسلحہ کیا ہوتا ہے۔ مومن تو بے تیغ بھی لڑ لیتا ہے۔ اصل چیز مومن ہے۔ اور اس آگ میں کچھ مومن بھی جلے ہیں۔ یہ تباہی اسلحے کے بدلے میں نہیں۔ ان مومنوں کے بدلے میں ہوگی۔ اسلحہ تو ہم آپ لوگوں سے حاصل کر ہی لیں گے۔“

ایسا نہ کریں انپیکٹر جمشید۔ انٹارجہ کہیں کا نہیں رہ جائے گا۔“

انٹارجہ کہیں کا نہ رہ جائے۔ یہی تو میری خواہش ہے۔ وہ مکرانے۔“

اچھی بات ہے انپیکٹر جمشید۔ آپ نہیں مانتے تو نہ سہی، لیکن اب میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔“  
کیا مطلب؟

اس بات کو چھوڑیں۔ جب آپ معاہدے کی کوئی بات نہیں کرتے۔ ہاں اب بتائیں۔ کیا آپ اپنے باقی ساتھیوں کو یہاں چاہتے ہیں؟  
ہاں بالکل۔“

”نقد نہیں۔ انٹارجہ کے شہری حوالے کرنا ہوں گے۔ مسلمان کے بدلے میں ایک لاکھ انٹارجہ کے غیر مسلم انپیکٹر جمشید بولے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ ایک کے بدلے میں ایک ہوتا ہے۔“  
”میرے نزدیک ایک مسلمان کی بہت بڑی قیمت ہے۔ اتنی کہ کوئی غیر مسلم سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور جبرال آپ بھی بہر حال غیر مسلم ہیں۔“  
”کوئی اور شرط پیش کریں۔“

”افسوس! میرے پاس اور کوئی شرط نہیں ہے۔“  
”کامیابی کی صورت میں ہمیں بحفاظت یہاں سے جانے جائے گا۔ یہ وعدہ آپ پہلے ہی کر چکے ہیں۔“  
”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔“

”تب ہم یہیں سے سب لوگ رخصت ہوں گے۔“  
”ساتھیوں کو آپ یہاں منگوا دیں۔“  
”کیا مطلب؟“

”میرے باقی ساتھی کہاں ہیں؟“  
”ہماری قید میں۔“

”میں انہیں یہاں چاہتا ہوں۔“  
”اچھا۔ لیکن سودے کی کیا رہی؟“



”فون کا ریسپور میرے منہ کے سامنے کریں۔ اور یہ نمبر ملا کر اس نے نمبر بتائے۔“

انھوں نے نمبر ملا دیے۔ دوسری طرف سے ریسپور اٹھا کر پر اس نے کہا:

”انپیکٹر جمشید کے تمام ساتھیوں کو فوڈا ایٹمی پلانٹ بھیج انھوں نے فون بند کر دیا۔“

## دیوار بن جاؤ

”آخری بار انپیکٹر جمشید — پھر مہلت نہیں ملے گی۔ مطالبہ کر لیں۔ چار گنا اسلحہ لے لیں۔ اور یہاں سے بحفاظت اپنے ملک روانہ ہو جائیں۔“

”نہیں! یہ پلانٹ تباہ ہو گا۔“

”تو پھر میرا اعلان بھی سن لیں۔ پلانٹ تباہ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ ابھی حیرال زندہ ہے۔ یہ دیکھیں۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی حیرال ہستے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ان بلا رہا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ صورت حال اس کے کنٹرول میں تھی۔ گویا ان کا سارا پروگرام آپ سیٹ ہو چکا تھا۔ ان کے رنگ زرد پڑ گئے۔ جسموں سے بیسے ہاتھ نکل گئے۔“

انھیں ایک ہند گاڑی میں ڈال کر ایٹمی پلانٹ کی چار دیواری تک لایا گیا۔ اس جگہ انھیں اتارا گیا۔ ابھی وہ اندر

کارخ کو رہے تھے کہ ایک آواز ابھری :

"ٹھہر دھئی۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

وہ چونک کر مڑے۔ ان کے پیچھے انسپٹر کامران مرزا کھڑے مسکرا رہے تھے :

"آپ۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

"ہاں ! میں۔" انھوں نے کہا۔

"یہ کون ہیں ؟ ہم صرف آپ لوگوں کو اندر لے جاتے ہیں۔ ایک پہرے دار نے کہا۔

"یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ہم سے بچھڑ گئے تھے۔"

"ان کے لیے اندر سے اجازت لینا پڑے گی۔"

"اس میں وقت ضائع ہو گا محمود۔ تم لوگ اندر جاؤ۔ اندر جا کر میرے لیے باہر فون کروا دو۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

چنانچہ انھیں اندر لایا گیا۔ پردیسر کے کمرے تک پہنچ کر ملازم نے کہا :

"دشک دے کر اندر چلے جائیں۔"

"شکریہ۔" محمود نے کہا اور دروازے پر دشک دی۔

واپس مڑ گیا۔ ادھر اندر سے کوئی جواب نہ پایا۔

نے پھر دشک دی۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔

"حیرت ہے۔ اندر سے تو کوئی جواب ہی نہیں مل رہا۔"

نصف ذرا ان صاحب کو واپس بلا کر لانا۔

"اچھا۔ آصف نے جانے کے لیے رخ بدلا ہی تھا کہ فرزانہ رل اٹھی :

"نہیں۔ اسے جانے دو۔"

"کیوں۔ کیا ہم اس کے ذریعے دروازہ نہ کھولائیں؟"

"نہیں۔ نہ جانے اندر کیا صورت حال ہے۔ اور پھر دروازہ

اند سے بند ہے۔ ہم نہیں کھولا سکتے تو وہ کس طرح کھولا دے

گا۔ لیکن اسے بلا کر لانے سے باہر یہ خبر پھیل جائے

گی کہ اندر کوئی گڑبڑ ہے۔"

"ادھر انکل کامران مرزا باہر اٹک گئے ہیں۔ اندر سے باہر

پیغام جائے گا تو وہ اندر آ سکیں گے۔"

"جب تک ہمیں اندر کی صورت حال معلوم نہیں ہو جاتی،

ان وقت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ فرزانہ تمہارے کانوں کو کیا

ہو گیا ہے۔" آصف نے جل کر کہا۔

"اوہ ہاں واقعی۔" فرزانہ نے کہا اور اپنا کان دروازے سے لگا

کرسنے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر اس نے کہا :

"میرا خیال ہے۔ اندر ہولناک قسم کی جگ ہو رہی ہے۔"

کروٹکل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔"



نے چونک کر کہا۔

”ہاں! ان کے منہ سے نکلا۔

”اگر انپکٹر کامران مرزا آگئے تو پھر میں کیا کام سے۔ چھوٹی پارٹی سے تو میں بیٹ لوں گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ فون کی طرف مڑا اور ایک جھٹکے سے تار توڑ دیا، پھر ان کی طرف پلٹ پڑا۔ اور

ان پر اس طرح ٹوٹ پڑا جیسے وہ بھوکا بھڑیا ہو۔

وہ بری طرح برکھلا گئے۔ اب برآمدے میں ایک ہونٹا لڑائی ہونے لگی۔ ادھر انپکٹر جمشید بے دم پڑے تھے۔ تاہم

انھوں نے اپنا منہ دروازے کی طرف کر رکھا تھا اور اس لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں انھوں نے کہا:

”چاہے جان چلی جائے۔ جیرال کو یہ برآمدہ عبور نہ کرنے دینا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ ہم تو چٹ جائیں انھیں جونکوں کی طرح آفتاب بولا۔“

جیرال جونکوں کو اپنے جسم سے اتار پھینکنا جانتا ہے۔ اس نے قدم سے بلند آواز میں کہا۔

”کاش! ہم انپکٹر کامران مرزا کو اندر بلا سکتے۔ انپکٹر جمشید نے سرد آہ بھری۔ پھر کوئی خیال آنے پر مسکرائے۔ پورا

ادھ اڑے باپ دے! آفتاب بولکھ کر بولا۔

”تب تو پھر ہمیں کمرے کا دروازہ کسی طرح کھلوانا چاہیے شوکی نے فوراً کہا۔“

”نہیں۔ ایسا کرنا بھی ہمارے حق میں غلط ہو سکتا ہے۔ جب تک صورت حال معلوم نہ ہو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”ہوں خیر۔ ابھی انتظار کر لیتے ہیں۔“

وہ انتظار کرتے رہے۔ مادے بے ہوشی اور پریشانی کے کا بُرا حال ہو گیا۔ آخر آدھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا۔ ساتھ ہی انپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی:

”میں نے جیرال کا کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔ اب صرف آدھ گھنٹہ ضائع کر دو، تاکہ پروفیسر صاحب اپنا کام کر ڈالیں۔“

اندر کا منظر دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئے۔ جیرال اور انپکٹر جمشید دونوں لوہان ہو رہے تھے؛ تاہم انپکٹر جمشید فری ہر گر چکے تھے، جب کہ جیرال دروازے سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔

”آپ باہر فون کر دیں ابّا جان۔ کہ باہر موجود انپکٹر کامران مرزا کو اندر بھیج دیا جائے۔“

”کیا مطلب۔ کیا وہ بھی دروازے پر موجود ہیں؟ جیرال

اس دم پکڑ لیے۔ اس بار وہ ہوشیار تھا۔ لہذا آصف کے  
پے پر اس کے پاؤں لگے اور وہ الٹ گیا۔ ایسے میں خان  
خان اسے کمر سے پکڑ چکے تھے۔ انھوں نے پورا زور لگا  
یا تھا۔ جیرال اپنے پیروں پر گھوما اور ایک جھٹکا جو دیا تو  
ان دھماکے سے جا ٹکرائے۔ اور ساکت ہو گئے۔

اس وقت تک محمود، آصف اور خان رحمان بے کار ہو چکے  
تھے۔ جیرال کا جسم اگرچہ انپکڑ جمید سے مقابلہ کرنے کے نتیجے  
میں بولہبان تھا، لیکن اس میں وہی دم خم تھا، یوں لگتا تھا  
یہ اس قدر خون بہ جانے پر بھی اس کی طاقت میں کوئی کمی  
نہی ہو۔

یونہی خان رحمان گرے۔ فاروق اور آفتاب نے ایک ساتھ  
جہل پر چھلانگ لگائی۔ فاروق اس کی گردن سے ٹٹک گیا۔  
جب کہ آفتاب اس کے دائیں بازو کو پکڑ کر جھول گیا۔  
جیرال یہ دیکھ کر ہنسنا۔ اس نے کہا:

”مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے چند کھلونوں نے مجھے پکڑ  
لیا ہو۔ ایک انسان جس طرح کسی ٹیڑھے مکوڑے کو اپنے  
ہاتھ سے جھٹک سکتا ہے، اسی طرح میں تم لوگوں کو جھٹک  
سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے جھٹکا دیا۔ فاروق اور آفتاب لڑھکیاں کھاتے

جسم خون آلود تھا۔ لہذا ان کی یہ مسکراہٹ بھی خون آلود  
تھی۔ اپنے ہاتھ اپنی کمر کی طرف دکھ کر انھوں نے  
جلدی جلدی فون کے تار جوڑے۔ پھر پلٹ کر فون کی  
طرف دینگنے لگے۔ آخر اس تک پہنچ گئے اور گے نمبر ڈائل  
کرنے۔ نمبر ڈائل ہونے کی آواز جیرال کے کانوں تک پہنچ  
گئی۔ وہ فوراً بولا:

”اوہ۔ تو انپکڑ جمید آپ نے تار جوڑ لیے۔“

اب میں اور کیا کرتا۔ لیٹے لیٹے یہ کام تو کر ہی سکتا تھا۔  
”اور یہ میری غلطی تھی۔ میں نے کیوں آپ کو ایک ہاتھ  
دسید نہیں کر دیا، لیکن اب بھی کیا بگڑا ہے۔“

یہ کہہ کر جیرال نے انھیں جھل دے کر اندر کی طرف  
چھلانگ لگا دی، لیکن منہ کے بل گرا، کیونکہ اسی وقت محمود  
نے اس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔

”اسے ہم لوگ سرکاری ٹانگ کہتے ہیں سٹر جیرال۔ اس نے  
شوخی آواز میں کہا۔

”غضب کی تھی۔ مان گیا بھئی۔“ وہ ہنسنا۔

ساتھ ہی محمود کے منہ پر ایک زبردست مڑکا لگا۔ اس  
کا منہ میٹھا ہو گیا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اب پھر  
وہ اندر کی طرف لپکا، لیکن آصف نے اس کے دونوں پاؤں



کی چالاکی نہ کرو۔ میرے پاس وقت پہلے ہی بہت کم ہے۔ جو کرنا ہے کر گزرو۔ تاکہ تم پھر یہ نہ کہہ سکو کہ میں نے تمہیں مہلت نہ دی۔  
 اچھی بات ہے۔ یونہی سہی۔

یہ کڑکرتیمنوں نے تین مختلف سمتوں سے اس پر حملہ کیا۔ اس طرح جیرال کو بیک وقت تین سمتوں میں نرم دینا پڑی۔ فرزانہ اپنی عادت کے مطابق تیر کی طرح اس کے بالوں کی طرف آئی۔ اور بال پکڑ کر بھول گئی۔ بال کافی لمبے تھے۔ اس نے اپنی انگلیاں ان میں جا دیں۔

”ارے ارے! یہ کیا کر رہی ہو؟ جیرال ہنسا۔  
 ”ائیں۔ آپ ہنس رہے ہیں۔ یہ ہنسنے کا کون سا موقع ہے؟“ اس نے کہا۔

”ہنس اس لیے رہا ہوں کہ میرے یہ بال مصنوعی ہیں۔ لہذا مجھے ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔“  
 ”کیا!؟ وہ سب ایک ساتھ چلائے۔“

جیرال کے ان الفاظ کے ساتھ ہی فرزانہ اپنا ہاتھ اس کی گردن کے گرد لے آئی۔ ادھر فرحت اس کی ایک ہاتھ اور رفعت ایک بازو مضبوطی سے پکڑ چکی تھی۔

”دور چلے گئے۔ ساتھ ہی ان کے منہ سے چیخیں بھی نکلیں۔  
 ”آج تو جیرال انکل غضب ڈھا رہے ہیں۔ بھیتوں کو خاطر میں نہیں لادہے۔ ایسے میں کھن کی آواز ابھری۔“

”ان کی جان پر جو بخنی ہے۔ بے چارے کو اپنا اتنا تباہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔“ شوکی سکرایا۔

جیرال اب جو دروازے کی طرف مڑا تو فرحت، فرزانہ اور فرزانہ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ جیرال انہیں دیکھ کر بہت ”دیکھنے میں ہم بالکل کمزور ہیں۔ انکل خیرال۔“  
 ”انکل جیرال۔ کیا نام ہے آپ کا بھلا؟“  
 ”جیرال۔“ اس نے بھٹا کر کہا۔

”ہاں تو مشر جیرال۔ ہم دیکھنے میں تو کمزور ہیں، دل پتلی ہیں، لیکن لڑائی بھڑائی میں ہم بہت تیز ہیں۔ ویسے تو آپ کو کچھ بتانا فضول ہے۔ کیونکہ آپ ہمارے ہاتھ میں پہلے سے سب کچھ جانتے ہیں۔“

”ہاں جانتا ہوں۔ تم ہاتھوں اور پیروں کی نسبت سے لڑتی ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ عقل میرے پاس بھی ہے۔“ وہ بولا۔

”تو آپ اسے گھاس چرنے کے لیے بھیج دیں نا۔“  
 ”یہاں گھاس کہاں۔ پھوڑو۔ میرا وقت ضائع کرنے

"انکل ! اب ذرا کوئی حرکت کر کے دکھائیں۔"

"ایک منٹ ! ایسے میں شوکی چلا آٹھا۔"

"تمہیں کیا ہوا بھتی ! جیرال نے حیران ہو کر کہا۔"

"ہمارے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ ہم بھینوں کا ہاتھ کیوں نہ بٹائیں؟"

"ضرور ضرور۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بلکہ یہ بہتر رہے گا۔ میں ایک ہی بار فارغ ہو جاؤں گا۔ تم چاروں بھی آ جاؤ۔"

"شوکی برادرز آگے بڑھے۔ دوسری ٹانگ شوکی نے دوسرا بازو مکھن نے، اخلاق نے پیٹ کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ اب صرف اشفاق رہ گیا۔"

"م۔ میں کیا کروں۔ پکڑنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔"

"دونوں ٹانگوں کے گرد پیٹ جاؤ۔ شوکی بولا۔"

"ہاں ! یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اشفاق نے اس کی دونوں ٹانگیں قدرے اوپر سے پکڑ لیں، کیونکہ وہ لمبا تو تھا ہی۔"

"بس۔ کوئی رہ تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔ اب آپ اپنی کوشش کریں۔"

"خوب کس کر پکڑ لو۔ جیرال نے کہا۔"

"خوب کس کر پکڑ چکے ہیں۔ اس سے زیادہ خوب کس کر ہیں پکڑ سکتے۔"

"اے یہ لو۔"

"یہ کہہ کر اس نے صرف ایک جھرجھری لی۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ چکنی بھلی کی طرح ان کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہو۔ اور پھر انھیں ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جھرجھری نے ان کی گرفت پہلے ہی کمزور کر دی تھی۔ جھٹکے نے دردی کسر نکال دی۔ وہ اچھل کر دور جا گرے۔ عین اس وقت ایک آواز ابھری :

"اے ! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"انھوں نے گرتے پڑتے بھی مڑ کر دیکھا۔ انپکٹر کامران مرزا ایک آدمی کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ جیرال بھی انھیں دیکھ کر وہی طرح پھونکا :

"بہت ہی اچھے وقت پر آئے انکل۔ جیرال کو دوکیں۔ ہم بے جھٹے کا کام کر چکے۔"

"اٹ مالک ! یہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"اندرونی دروازے سے انپکٹر کامران مرزا کے ساتھ آنے لگے۔ بھونچکا رہ گیا۔ اسی وقت انپکٹر کامران مرزا کا ایک ہاتھ



اس کے سر پر پوری قوت سے لگا۔ وہ تورا کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ادھر جیرال نے ان کے پاس سے نکل جانے کے لیے ایک اونچی پھلانگ لگائی۔ انیکٹر کامران نے بھی ایک اونچی پھلانگ لگا دی۔ دونوں کے جسم ٹکرائے اور نیچے آ رہے۔

”بہت خوب انکل۔ اب یہ حضرت یہاں سے آگے سرکنے پائیں۔ آصف چمکا۔  
”جمشید کہاں ہیں؟“

”وہ بھی اپنے حصے کا کام کر چکے ہیں۔ بس آپ کے ساتھ کام رہتا ہے۔“  
”لیکن انھوں نے ہی تو فون پر ہدایات دی تھیں کہ مجھے یہاں بھیج دیا جائے۔“

ان سب نے چونک کر اندر کی طرف دیکھا، لیکن انیکٹر کامران کی نظریں جیرال پر جمی رہیں۔ اس نے پھر پھلانگ لگائی۔ اس بار ساتھ ہی انیکٹر کامران بھی اُپھٹے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اور انیکٹر کامران اس سے چمٹ گئے۔

”اب تفصیل بتاؤ۔ وہ بولے۔  
محمود جلدی جلدی تفصیل بتانے لگا، آخر میں محمود نے کہا

اور اس حالت میں آبا جان نے کمر کے پیچھے ہاتھ کر کے ہاتھ جوڑے اور دروازے کے فون کے نمبر ملائے تھے۔ اب کہیں جا کر آپ کے آنے کا سامان بنا۔  
بہت خوب! صورت حال اب یہ ہے کہ ہمیں مسٹر جیرال کو یہ روکنا ہے۔  
”جی ہاں بالکل۔“

لیکن تم سب مل کر بھی مجھے نہیں روک سکتے۔ جیرال غرایا۔  
ان الفاظ کے ساتھ ہی جیرال نے زور جو لگایا تو وہ انیکٹر کامران مرزا کی گرفت سے نکل کر آگے بھاگا۔ لیکن مرزا نے بل گرا، کیونکہ محمود نے اپنی سرکاری ٹانگ آگے کر دی۔ یہ دیکھ کر فاروق مسکرایا۔  
”اسے ہم سرکاری ٹانگ کہتے ہیں۔“

ادھر اس کے گرتے ہی انیکٹر کامران مرزا نے اس پر پھلانگ لگائی۔ لیکن جیرال کروٹ لے گیا اور وہ فرش پر گرے۔  
فدا پٹا۔ ان کے سینے پر سواہ ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی گردن پر جما دیے۔

انیکٹر کامران مرزا نے ایک دو ہتھکڑی اس کی ٹھوڈی پر دیکھی۔ لیکن انھیں خود اپنے ہاتھ ٹوٹتے محسوس ہوئے۔  
اب انھوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی کیں اور

## صبر کریں

”وہ مارا۔ ابا جان ایک بار پھر میدان میں آ گئے۔“ فرزانہ کی آواز گونجی۔

ادھر جیرال انپکٹر کامران مرزا کی گردن پر برابر نقد لگا رہا تھا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ مانی بہت سے لے رہے تھے۔ ایسے میں بھی وہ اپنی کوشش میں مصروف تھے۔ اور آخر وہ اپنے دونوں پیر اس کی گردن تک لے آئے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ان کے دونوں پیروں کی گرفت میں تھی۔ انھوں نے لڑ لگانا شروع کیا۔ جیرال کا جسم ان کے سینے پر لٹکھنے لگا۔ وہ اس منظر کو حیرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی جیرال کے ہاتھ گردن پر لٹکے، لیکن کب تک۔ جب جسم اوپر اٹھنے سے نہ رک سکا تو ہاتھ کب تک گردن پر جمے رہتے۔ لہذا ہاتھ بھی

اس کی آنکھوں میں گھونپ دیں، لیکن ایک بار پھر ان کی سخت چیز سے ٹکرائیں۔ شاید آنکھوں پر کوئی خول تھا۔ نظر نہ آنے والا خول۔ جیرال ہنسا:

”کامران مرزا تمہارے دونوں وار خالی گئے۔ تیرا گردن تو اب چھوٹے گی نہیں۔“

”کیا ہم مدد کو آئیں کامران مرزا؟ ایسے میں خان کی آواز ابھری۔

”کیا آپ اس قابل ہو گئے ہیں انکل؟ شوکی نے ہو کر کہا۔

”بھئی اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔“ خان دھان اداس میں سکرائے۔

”نہیں خان دھان۔ البتہ تم لوگ اس کے راتے میں بن کر کھڑے ہو جاؤ، تاکہ میرے بے کار ہونے کی صورت میں بھی جیرال برآمدہ مجھ نہ کر سکے۔“

”ان شاء اللہ۔“ ان سب کے منہ سے نکلا۔

عین اس وقت انھوں نے انپکٹر جمیلہ کو آٹھ کھینچتے دیکھا۔



اٹھنے لگے۔ حیرال نے بہت زور لگایا، لیکن انیسٹر کامران مرزا اور انیسٹر جمشید کا یہ انداز بہت خاص تھا۔ دونوں بیڑوں میں جب گردن پکڑ کر اٹھاتے تھے تو پھر دشمن کسی طرح ان کے جسم سے چٹا نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر اس کے گردن سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے کمرے کے دروازے کو ایک جھٹکا مارا۔ وہ گویا ہوا میں اڑتا ہوا کمرے میں جا کر گرا۔ انیسٹر جمشید ابھی دروازے پر ہی تھے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دروازہ بند کر دیا۔ اور باہر سے دروازہ لاک کر دیا :

”واہ ! یہ عجیب ہوئی۔“

لیکن یہ بہت اچھا ہوا۔ اب اس ملازم کو یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔ اور ہمیں بھی ساتھ والے کمرے میں بیٹھ جانا چاہیے۔ تاکہ باہر سے کوئی آجائے تو کسی کو کوئی اندازہ نہ ہو سکے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے پروفیسر صاحب جلد فارغ ہو جائیں گے۔

زخمی آدمی کو اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں لے آیا گیا۔ یہ کمرہ یوں تو آلات سے بھرا بیڑا تھا، لیکن اس میں تھا کوئی نہیں۔ وہ دروازہ تھوڑا سا کھول کر بیٹھ گئے :

”حیرال بھی کیا۔ ارے۔ غضب خدا کا۔ غلطی ہو گئی۔“

پکڑ جمشید چلائے۔

”لگ۔ کیا مطلب؟“

”ہم نے حیرال کو بند کر دیا۔ اور اس نے اندر بند ہوتے ہی فن کر دیا ہو گا۔ باہر موجود نگراؤں کو خبر کر دی ہو گی۔“

”خبر ہو گئی۔ اس بات کا کسی کو خیال تک نہیں رہا۔ کس قدر ہولناک غلطی ہوئی ہے۔“

”لیکن اب تو ہو گئی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے؟“  
”میں اس لمحے پورا پلانٹ بھاری قدموں کی آوازوں سے کچل اٹھا۔ سیکڑوں رائفلوں والے برآمدے میں نظر آنے لگے۔ اور انھیں ہاتھ اٹھانا پڑے۔“

”دروازہ کھول دو۔“ مسٹر حیرال کو باہر نکال لو۔ ایک ملٹری انیسٹر نے کہا۔

”دروازہ کھولا گیا۔ حیرال فوراً باہر نکلا اور دوڑ لگا دی، ساتھ ہی وہ چلا اٹھا :

”ان لوگوں کو قابو میں کر لیا جائے۔ میں ان کے ساتھی پروفیسر داؤد کو پکڑ کر لاتا ہوں۔ اس وقت تک وہ ایٹمی پلانٹ کے اڑانے کے لیے نہ جانے کیا کچھ کر چکا ہو گا۔“

”کیا اڑاؤ وہ سب ایک ساتھ چلائے۔ ان کے رنگ دودھ

کی طرح سفید ہو گئے۔

نہیں۔ تم گولی چلاؤ۔

جیرال ہانگوں کی طرح بھاگا چلا گیا۔ وہ سیدھا پلانٹ کے مرکز کی طرف گیا۔ وہاں آخر ایک ڈال میں اسے پروفیسر داؤد اور اس کا ساتھی نظر آ گئے۔

”بس پروفیسر صاحب۔ اب ہاتھ روک لو۔ اور جہاں چاہو گڑ بڑ کی ہے۔ اسی گڑ بڑ کو دور کر دو۔ جیرال کی گولی آواز نے ان دونوں کو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا،

وہ دونوں بالکل پُرسکون ہو گئے۔ پروفیسر داؤد بولے: ”میں اپنا کام قریب قریب مکمل کر چکا ہوں۔ اسلئے گودام میں لگائی جانے والی آگ کا آج میں نے انتظام لیا۔ اب اس پلانٹ کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اور مسٹر جیرال۔ اب تم ہمیں، حفاظت ہمارے پہنچانے کے بھی ذمے دار ہو۔“

نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پلانٹ ابھی صحیح سلامت ہے۔ اور پروفیسر تم جلد از جلد اس کو تباہ ہونے سے روکو۔ ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

”خبردار اڑا دو۔ پروفیسر داؤد بولے۔ تو تم۔ نہیں مانو گے۔“

جیرال نے کہا اور واپس دوڑ لگا دی۔ دونوں اس کے پیچھے چلے اور اس پر امداد میں آئے۔ حالات جوں کے توں تھے۔

پروفیسر اپنا کام پورا کر چکے ہیں۔ جیرال نے بوکھلا کر کہا۔



تو نہ ہانا پسند نہیں کرتے۔ ہم میں اور ان میں یہ فرق تو ہے۔ لہذا انھیں اعلان کرنے دیں۔ اور مسٹر جیرال۔ اب وقت بہت کم ہے۔ کہیں ہم سب بھی جھسم نہ ہو جائیں۔ جلدی کریں۔“

اور پھر وہاں جھگڑا مچ گئی۔ ملٹری میں بھی انھیں جھول کر باہر کی طرف دوڑنے لگے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ پھر سپیکر پر اعلان کیا جانے لگا۔ کہ پلانٹ خالی کر دیا جائے۔ آگ بھڑکنے والی ہے۔ تمام لوگ دوڑتے چلے گئے۔

ہم اب جیرال کے ذریعے بحفاظت جانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایک بے آباد ساحل پر ہمارے لیے ایک لارچ تیار ہے۔ وہ ہمیں ایک جزیرے تک پہنچائے گی، جزیرے سے ہم ایک بحری جہاز پر سوار ہوں گے اور اس طرح اپنے ملک پہنچ جائیں گے۔ انسپکٹر جشید نے جلدی کر دی۔

لیکن ہم ساحل تک کس طرح پہنچیں گے؟

یہاں بھی آپ کے لیے گاڑی تیار ملے گی۔ فکر نہ کریں۔ خفیہ فورس کے نمبر انے کہا۔

اور پھر وہ گاڑی میں روانہ ہو گئے، لیکن جلد ہی ان کی

”بہت خوب! یہ ہوئی نا بات۔“

”لیکن آپ لوگ ان سے کہ دیں۔ یہ پلانٹ کو تباہ ہونے سے بچالیں۔“

”اور ہم ایسا کیوں کہ دیں۔ جب کہ یہ ہمدانی عین غلط ہے۔ انھوں نے کہا۔“

”مان جائیں میری بات۔“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“

تب ہم تم لوگوں کو یہاں بند کر جائیں گے۔ تاکہ لوگ بھی جل کر راکھ ہو جاؤ۔ ملٹری آفیسر نے کہا۔

”مسٹر جیرال نے وعدہ کیا تھا۔ اگر ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو یہ ہمیں بحفاظت ہمارے ملک تک جانے دیں گے۔ کیا جیرال اپنے وعدے سے پھر جائیں گے۔“

”نہیں۔ جیرال اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا۔“ تو پھر خدائے پلانٹ سے نکل چلیں۔ اعلان کرا دیں۔ پلانٹ میں کام کرنے والے باہر کی طرف دوڑ لگا دیں۔ پروڈیوسر دادہ بولے۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ جب کہ ان لوگوں نے ہمارے اگلے کے ڈپو میں کام کرنے والے زندہ جلا ڈالے۔“

”یہ لوگ انسانی جانوں کی قیمت نہیں جانتے، لیکن ہم بلا دیں۔“

گھاٹی کو گھیر لیا گیا اور گرفتار کر کے ایک بڑے ٹال میں لایا گیا :

"ایٹلی پلانٹ میں آگ بھڑک چکی ہے۔ ہمارے ماہرین آگ پر قابو پانے کی سرٹوٹ کووش کر رہے ہیں، لیکن ایک تک انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ آپ اگر چاہیں تو اس آگ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔"

"جی نہیں! اب میرے کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ پر وئیر داؤد، لو لے۔"

اس وقت ان سے بات ایک ملٹری آفیسر کر رہا تھا، جس کے قدموں کی آواز گونجی۔ انھوں نے دیکھا۔ جیرال چلا آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچھا ہوا تھا۔

"مسٹر جیرال! آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر ہم کامیاب گئے تو آپ ہمیں بحفاظت جانے دیں گے۔"

"ہاں! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ اور میں وعدہ پورا کروں گا، لیکن اس سے پہلے میں ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اگر پروڈیوسر صاحب آگ بجھا دیں تو بہت کچھ بچ جائے گا۔"

"جی نہیں۔ آپ اپنے ماہرین سے کام لیں۔ جیسے ہم نے اپنے مجاہدوں سے کام لیا تھا۔"

ہمارے پاس وہ مجاہد نہیں ہیں۔ جو آگ میں کود جائیں۔"

واقعی۔ جرنل مشرف جیسے لوگ آپ کے پاس کہاں؟

اگر ہمارے پاس ایسے لوگ نہیں ہیں تو ویسے بھی نہیں، جیسے آپ کے ملک میں ہیں؟

کیا مطلب؟

مطلب تو آپ کو اپنے وطن پہنچ کر معلوم ہوگا۔ دراصل

اپنے منصوبے میں حد درجے مصروف رہنے کی وجہ سے آپ کو بہت دنوں سے کوئی اخبار نہیں پڑھ سکے۔

ہاں! یہی بات ہے۔ کیا ہمارے ملک میں کوئی بڑی تبدیلی آچکی ہے؟

ہاں! لیکن اس تبدیلی کی خبریں آپ بعد میں حاصل کرتے رہے گا۔ مجھ سے تو آگ کی بات کریں۔

"جو آگ ہم لگانے آئے تھے۔ لگانے کے بعد خود اس کو کس طرح بجھا سکتے ہیں؟"

جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ ان لوگوں کو ان کے ملک جانے والی پرواز میں سوار کرا دیا جائے۔ جیرال نے

ملٹری آفیسر کو ہدایت دی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ یہ ہمارے مجرم ہیں۔

لیکن میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔



"میرے خیال میں آپ ایسا وعدہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔"

"کیا کہتے ہیں۔ میں کبھی اختیارات رکھتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ ہم ان لوگوں کو نہیں جانے دیں گے۔"

اچانک جیڑال حرکت میں آیا۔ اور ملٹری آفیسر کی گردن اس کی گرفت میں نظر آئی۔

"چلو ہدایت دو۔ اور جب تک یہ لوگ جہاز پر پرواز نہیں کر جاتے۔ میں تمہاری گردن نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ اس کا انجام جانتے ہیں۔"

"مجھے پروا نہیں۔ لیکن میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔"

اس لیے کہ جیڑال اپنے اصول کا بہت پکا ہے۔

"اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کو ایر پورٹ پر پہنچاؤ۔ اور جہاز میں بیٹھا کر آنا۔"

"آپ جہاز سے مجھے فون کریں گے۔ جب جہاز پرواز کو جلائے گا۔"

اس وقت فون کریں۔ میرا یہاں کا نمبر نوٹ کر لیں۔

"مان گئے مسٹر جیڑال۔ آپ کو اور آپ کی اصول پسندی کی۔"

"لیکن یہ ان کی آخری اصول پسندی ہو گی۔ آپ لوگوں کے جانے کے بعد انھیں جیل میں ڈالا جائے گا۔"

"پروا نہیں۔ جیڑال بولا۔"

اور پھر انھوں نے جیڑال کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ دیا۔ یہاں تک کہ ان کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

خود ہی دیر بعد وہ جہاز میں اڑے جا رہے تھے اور جیڑال کو یہ اطلاع دے چکے تھے کہ وہ پرواز کر چکے ہیں۔ نیچے انھیں ایک طرف آگ کے شعلے بلند ہوتے نظر آ رہے تھے۔

ایسے میں پروڈیوسر داؤد بولے:

"ابھی تو یہ آگ اور بلند ہو گی۔ انتشار کے لیے ایک مسئلہ بنے گی۔"

"اور انتشار کے لیے حکومت جیڑال کے لیے مسئلہ بنے گی۔"

"دیکھا جائے گا۔ انپکٹر جمشید سکرائے۔"

"اگرے ہاں! ہم جہاز میں تو اخبارات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ایسے میں انپکٹر کامران مرزا نے چونک کر کہا۔"

انھوں نے اتر ہوٹلس کے ذریعے اخبار منگوائے اور ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اب انھیں معلوم ہوا۔ ان کے ملک میں حکومت تبدیل ہو چکی تھی۔ صدر کو فوج نے معزول کر دیا تھا اور ایک اور آدمی کو صدر بنا دیا گیا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ اس قدر جلد اس قدر بڑی تبدیلی کیسے آ گئی تھی۔ یہ بات جیڑال کُن تھی۔

آخر وہ اپنے ملک کے ایر پورٹ پر اترے۔ انھوں نے

جہاز سے ہی فون کر دیے تھے۔ لہذا بیگم حمید، بیگم کامران  
مرزا۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد وغیرہ کے بچے ایر پور  
موجود تھے۔ اور کوئی استقبال کرنے نہیں آیا تھا۔ مطلب  
کہ حکومت کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔ البتہ اکرام ضرور  
موجود تھا۔ ان سب کے علاوہ ایک طرف ایک اور شخص  
موجود تھا۔ اور وہ تھا ٹی ایس ایم۔ پھر سب لوگ ایک  
کی طرف بڑھے۔ ٹی ایس ایم سے مصافحہ کرتے ہوئے  
حمید بولے:

"آپ سے فرصت میں باتیں ہوں گی۔"

"آپ لوگوں کو اس قدر بڑی کامیابی مبارک ہو، اکرام سے  
اداس انداز میں کہا۔

"لیکن تم لوگوں کے چہروں پر خوشی کیوں نہیں ہے؟  
حکومت تبدیل ہو گئی ہے اور نئی حکومت نے آپ کے

اس منصوبے کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ اسی لیے  
کی سطح پر کوئی استقبال کرنے نہیں آیا۔ یہی نہیں۔ ایک

اور بھی بُری بات ہوئی ہے۔ اکرام نے جلدی جلدی کہا۔  
اور وہ کیا؟ وہ ایک ساتھ بولے۔

"نئی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ جرنل  
مشرف صاحب کو ریٹائر کر دیا ہے۔"

کیا!؟

وہ ایک ساتھ چلائے۔ ان پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا،  
پھر انیکٹر حمید بولے:

"پھر یہ نئی حکومت انشارجہ کی سازش سے آئی ہے۔"

غضب کی بات ایک اور ہے۔

اور وہ کیا؟

موجودہ کمانڈر انچیف کے ریٹائر ہونے کے بعد جرنل جاوید

انفرت کمانڈر انچیف بننے والے تھے۔ اور انھوں نے ایک

ایسا کارنامہ سر انجام دیا تھا کہ انشارجہ کے منصوبے پر پانی

پھر گیا تھا۔ لہذا انھوں نے سوچا۔ اگر یہ شخص کمانڈر بن

گیا۔ اور کبھی مارشل لا لگا بیٹھا تو انشارجہ کی تو ایسی کی تہی

کر کے رکھ دے گا۔ ہے بھی مذہبی آدمی۔ لہذا سب سے

پہلے انھیں ریٹائر کیا گیا۔

یہ بہت بُرا ہوا۔ بہت سے بھی زیادہ بُرا۔ انیکٹر کامران

مرزا نے اس انداز میں کہا۔

میں اسی وقت انھیں ملٹری نے اپنے گھر سے لے لیا:

کیا بات ہے جناب؟

آپ کو یہاں سے سیدھے ایوان صدر جانا ہے۔ نئے

صدر آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔



تو اس کے لیے ہمیں گھرے میں لینے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اسی طرح چلتے ہیں۔ کیا ہم مجرم ہیں کہ ہمیں حراست میں لے کر وہاں پہنچایا جائے؟

"یہی حکم ملا ہے کہ گرفتار کر لیا جائے۔"

"اچھی بات ہے۔" انپکٹر جمشید بولے۔

"بہت بری زیادتی ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"صبر کریں پروفیسر صاحب۔ اس سے زیادہ عظیم زیادتی ہو گی کہ دشمن ملک سے تو ہمیں باعزت طور پر بیعت دیا جائے گا۔"

اور اپنے ملک میں ہمیں گرفتار کر لیا جائے۔ جب کہ اس وقت ملک کی بدایات کے عین مطابق گئے تھے۔ پھر مجرم کس طرح بنتے ہیں؟

"اس طرح کہ انشا رب میں آپ کو حکم بھیجا گیا تھا کہ اس حالت میں بھی آپ لوگ ہیں۔ فوراً وطن پہنچ جائیں۔ آپ لوگ نہیں پہنچے۔"

"لیکن ہمیں یہ حکم نہیں ملا۔" انپکٹر جمشید بولے۔

"یہ حکم تو اب بھی آپ کی جیب میں موجود ہے۔ کیا مطلب؟"

"آپ اپنی جیب دیکھیں۔"

انھوں نے جلدی سے جیب میں لامعہ ڈالا۔ اس میں

ایک سرکاری کاغذ نکلا، جس پر لکھا تھا:

"انپکٹر جمشید اور ان کے تمام ساتھیوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ انشا رب کا مشن روک دیا جائے اور فوری طور پر وطن واپس پہنچا جائے۔"

"یہ حکم میری جیب میں کیسے آیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہر حال مجھے کسی نے نہیں دیا۔"

"آپ کی بات پر اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔" مٹری آفیسر نے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ نہ کریں اعتبار۔"

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے جمشید؟" پروفیسر داؤد بوکھلا اٹھے۔

"فکر نہ کریں۔"

آخر انھیں نئے صدر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے گھور کر ان سب کو دیکھا اور بولے:

"یہ آپ لوگ کرتے کیا پھر رہے ہیں۔ انشا رب سے تعلقات برطانیہ کے بغیر ہم کس طرح حکومت کر سکیں گے۔ آئندہ آپ بلا اجازت ایسے کس مشن پر نہیں جائیں گے۔"

"ہم سابقہ صدر کے حکم کے مطابق گئے تھے۔"

"وہ حکومت اب نہیں رہی۔ اب آپ کو ہماری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہو گا۔"

”بہت بہتر! کیا اب ہمیں اجازت ہے؟“

”ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔“ صدر پہلی بار مسکراتے۔

”کیا کہا؟ وہ چلا اُٹھے۔“

”ہاں! ایوانِ صدر سے۔“ انشاد کے صدر نے مجھ سے صلح کر لی۔ ورنہ جیل سے تو میں ویسے بھی فرار ہو جاتا اور پھر انشاد مجھ سے کوئی کام نہ لے سکتا۔ یہ بات محسوس کرتے ہی صدر نے صلح کر لی۔ اور اب نئے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔“

”اوہ۔ کیسا منصوبہ۔ کیا مطلب؟“

”بھئی۔ یہ لوگ تو منصوبے بناتے ہی رہتے ہیں۔ اب نہ جانے کس اسلامی ملک کے خلاف مجھے بھیجا جائے والا ہے، میں نے سوچا، لگے اُنھوں آپ کی خیریت معلوم کر لوں، آپ خیریت سے پہنچ گئے تھے نا؟“

”ہاں! بالکل۔“

”بہت جلد پھر ملاقات ہو گی۔“

”ہم انتظار کریں گے۔“ انیکٹر جمشید مسکراتے۔  
”چلتے چلتے ایک بات اور۔“ کاغذ کا وہ پرزہ میں نے ڈائی کے دوران آپ کی جیب میں ڈالا تھا۔ آپ کی نئی حکومت کا پروگرام آپ لوگوں کو جیل کی ہوا کھلانا تھا۔ لیکن پھر کسی نے انھیں بتایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو پورا ملک آپ کی بات میں اُٹھ کھڑا ہو گا، لہذا نئی حکومت رک گئی۔“

وہ دہاں سے نکل آئے۔ اب ان کا رخ جرنل کے گھر کی طرف تھا۔ انھوں نے اداس انداز میں ان استقبال کیا:

”یہ سب کیسے ہوا سر؟“

”بس! بس! سب، سیاہی چکر ہیں۔ اس چکر میں بڑے بڑے آ جاتے ہیں۔“

”لیکن یہ بہت ظلم ہوا ہے۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔“  
”کام ہمارے ذمے لگایا گیا۔ وہ کرنا ہے۔ اب کوئی کام نہیں رہ گیا تو اپنے گھر بٹو کام کریں گے۔“ وہ مسکراتے۔  
”ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قوی ہیروز کو اس طرح

ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ یہ اُنھوں نے پہلی بار محسوس کیا۔  
”دہاں سے بوجھل دل کے ساتھ گھر پہنچے تو فون کی بج رہی تھی۔ انیکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر فون کا ہٹن دیا۔“  
”جیرال بات کر رہا ہوں۔“

”جیل سے؟ انیکٹر جمشید بولے۔“

”نہیں۔ ایوانِ صدر سے۔“



”اچھا ہی ہوتا۔ اگر ہمیں جیل میں ڈال دیا جاتا، کیونکہ اب جو زندگی ہم گزاریں گے۔ وہ بالکل بے کیف ہوگی۔“  
 ”تو پھر میرا مشورہ مانیں۔“ جیرال نے بازدارانہ انداز میں کہا۔  
 ”اور وہ کیا؟“

”نئی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر۔“

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب۔ ہم اپنی حکومت کے خلاف ایسے کام نہیں کرتے۔ یہ حکومت جیسی بھی ہے۔ ہماری اپنی ہے۔ ہم ملک کے مفاد میں کام کرتے ہیں۔ کرتے رہیں گے۔ حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک انپکٹر جمشید۔ ایک الجھن اور دُور کر دیں۔“  
 ”انشارجہ کے کونسل ہال میں آپ لوگ کس طرح داخل ہوئے؟“  
 ”بھئی گٹر کے ذریعے آئے تھے اور گٹر کے ذریعے چلے گئے تھے۔“ انھوں نے کہا۔

”کیا!!! وہ دھک سے رہ گیا۔“  
 ”اسی وقت انھوں نے اپنے پیچھے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو آئی جی شیخ شہزاد احمد تھے۔“

”اچھا انپکٹر جمشید۔ پھر ملاقات ہوگی۔ بلکہ بہت جلد ہوگی۔ کیونکہ انشارجہ کے صدر نے ابھی ابھی مجھے اشارہ کیا۔“

”کر آئندہ منصوبہ بھی آپ لوگوں کے ملک کے خلاف ہے۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ ہم استقبال کے لیے تیار ہیں۔“ انپکٹر  
 ”سکرائے اور جیرال نے ہنس کر دسیور دکھ دیا۔“

”جمشید۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ یہ حکومت ایک سازش کے  
 ”کئی ہے۔ زیادہ دن نہیں چلے گی۔ سابقہ صدر سے  
 ”ی بات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب وہ صدر بننے  
 ”واش نہیں رکھتے۔ نئی حکومت نے تین ماہ بعد انتخابات  
 ”نے کا وعدہ کیا ہے۔ لہذا تین ماہ سے پہلے کوئی خالص  
 ”تلاش کر لیں۔“

”تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے سر۔ آئندہ ایکشن میں  
 ”ایا کامیابیاں جنرل مشرف حاصل کریں گے ان شاء اللہ۔“  
 ”کیا کہا۔ جنرل مشرف۔ وہ چونک کر بولے۔“

”ان سر۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“  
 ”بہت بہترین خیال ہے۔ ہم انھیں ضرور آمادہ کریں گے۔“  
 ”تین ماہ بعد جنرل مشرف ملک کے نئے صدر بن چکے

”اور انھوں نے انپکٹر جمشید اور ان کے تمام ساتھیوں  
 ”اعزاز میں ایک سادہ دعوت کا اعلان کیا تھا۔ اب  
 ”کے چہروں پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ دعوت میں  
 ”لوگ انھیں مبارک باد دے رہے تھے۔ نئے صدر صاحب

کو بھی مبارک باد مل رہی تھی۔ دعوت کے آخر میں  
صدر نے انیکٹر جمشید اور انیکٹر کامران مرزا کو سینے  
لگاتے ہوئے کہا:

”انشاء جہ کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے والا آپ  
کارنامہ ایک مدت تک یاد رکھا جائے گا۔ میں جانتا  
وہ پھر کسی نئی سازش کے لیے دانت تیز کر رہا ہوگا  
مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ آپ لوگ اس کے دانت کھینچنے  
کے لیے پہلے سے تیار ہوں گے۔“

”اِنْ شَاءَ اللہ۔“

اُن کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

